سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

کسی شخص یا گروہ کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ: وہ انتہائی جذباتی مواقع پر انتہائی عقلی فیصلے کر سکے۔ اسی کو صبر کہتے ہیں۔ زندگی ایک مسلسل امتحان ہے جس میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی جذبات سے مغلوب ہو جائے، وہ متاثر ذہن کے تحت کارروائی کرنے لگے۔ ایسے مواقع پر اپنے عقل و ہوش کو باقی رکھنا اور واقعات سے الگ ہو کر واقعات کے بارے میں فیصلہ کرنا قرآن کی اصطلاح میں صبر ہے اور یہی کسی کی کامیابی کی واحد یقینی ضمانت ہے۔ ولکم النصر ما صبرتم

شمارہ ۱۴
جنوری ۱۹۷۸

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

فہرست

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم سالانہ زرتعاون بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تاکہ الرسالہ آپ کے نام جاری رکھا جاسکے۔ منیجر

اداریہ

الرسالہ کوئی صحافتی کاروبار نہیں، وہ اعلانِ حق اور اصلاح امت کی ایک صحافتی مہم ہے۔ اس سے کسی کا کوئی ذاتی فائدہ وابستہ نہیں۔ جن لوگوں نے اس کو جاری کرنے کی ہمت کی ہے، ان کے لئے وہ سراسر ایک گھاٹے کا سودا ہے۔ اس کی کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ امت میں کچھ ایسے لوگ اٹھیں جو اس کو "اپنا کام" سمجھ لیں اور اس کو اس طرح آگے بڑھانا چاہیں جس طرح کوئی شخص اپنے ذاتی کام کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس کے برعکس الرسالہ کو پڑھنے والے اگر اس کو ایک ڈائجسٹ یا معروف معنوں میں علمی و ادبی پرچہ سمجھتے رہے تو ناممکن ہے کہ یہ صحافتی مہم کسی نتیجہ خیز انجام تک پہنچے۔

قوموں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس میں ہر شخص اپنی ذمہ داری کو جانتا ہو۔ جس قوم میں دوسروں کی ذمہ داری جاننے والے ماہرین پیدا ہونے لگیں، اس کے لئے اسباب کی اس دنیا میں، موت کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

بدقسمتی سے اس معاملہ میں ہمارا تجربہ زیادہ خوش آئند نہیں۔ ہمیں ایسے خطوط تو روزانہ ملتے ہیں جن میں ہمارا کوئی ہمدرد ہم کو ہماری "ذمہ داریاں" یاد دلاتا ہے۔ مگر ایسے خطوط موصول کرنے کی خوش قسمتی ہم کو کم ہی نصیب ہوتی ہے جس میں کوئی بندۂ خدا ہمیں اس بات سے مطلع کرے کہ الرسالہ کے سلسلے میں اس نے اپنی ذمہ داریوں کو جان لیا ہے۔

زندہ افراد کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ اگرچہ کم ہی قومیں ہیں جو اس معنی میں سرمایہ دار ہوں۔

جب لوگ اندھے اور بہرے ہو جائیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: "زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے لوگ گزرتے رہتے ہیں۔ مگر ان پر دھیان نہیں دیتے۔" (یوسف ۱۰۵) جو بات ہم انسانی زبان میں کہنا چاہتے ہیں، وہ کائنات میں زیادہ بہتر طور پر خدائی زبان میں نشر ہو رہی ہے۔ پھر خدا کی آواز کو سننے کے لئے جب لوگوں کے کان بہرے ہوں تو انسان کی آواز سے وہ کیا اثر قبول کریں گے۔

کائنات کی وسعتوں اور عظمتوں سے زیادہ کون اس بات کا سبق دے سکتا ہے کہ انسان انتہائی طور پر ایک حقیر وجود ہے۔ عجز کے سوا کوئی اور رویہ اس کے لئے درست نہیں۔ اس کے باوجود انسان گھمنڈ کرتا ہے (اسراء ــ ۳۷)

پہاڑوں کے پتھریلے سینے سے بہہ نکلنے والے پانی کے دھارے سے بڑھ کر کون اس حقیقت کو بیان کر سکتا ہے کہ تم دوسروں کے لئے سیرابی اور تراوٹ کے دریا بن جاؤ۔ مگر انسان دوسروں کے لئے پتھر سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوتا ہے (بقرہ ــ ۷۴)

زمین کے سینہ پر کھڑے ہوئے تناور درختوں سے زیادہ بہتر طور پر کون اس حقیقت کا اعلان کر سکتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرو تاکہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے۔ اس کے باوجود لوگ وقتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند اپنی تعمیرات کھڑی کرتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ لیا (ابراہیم ــ ۲۶)

اگر لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ ہو تو کائنات ہر آن حق و صداقت کا اعلان کر رہی ہے۔ اور جب خدائی اعلان کو سننے کے لئے لوگوں کے کان بہرے ہو جائیں۔ اور خدائی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے لوگوں کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہوں تو کوئی انسانی آواز انھیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کو ہوش میں لانے کے لئے قیامت کی چنگھاڑ ہی کا انتظار کرنا چاہیے۔

The 'big bang' was not all that big

WASHINGTON, December 10 (Reuter).

TWO California scientists have come up with new data suggesting that the "big bang," which brought the universe into being some 15 billion years ago, was a much smoother and more orderly event than popularly imagined.

In an announcement from the National Aeronautics and Space Administration (NASA) recently, Dr. Rechard Muller and Dr. George Smoot of the University of California said they had found that the universe was expanding at a constant rate in almost all directions.

The now findings "take the simplistic big bang theory a long step down the road and give us a model that will eventually help to unravel the mystery of how the universe was formed," Dr Smoot said in an interview.

Most astronomers believe the universe began with a huge explosion. Some think this was a chaotic mess, occurring at different speeds in different places, giving rise to great swirls of matter.

Others see it as an homogeneous event, sending newly formed matter out in all directions at the same speed.

But the new findings seem to indicate that the bang was smoother than even the "homogeneous school" had expected.

It appears, said Dr Smoot, that "there was no explosion such as a Super Nova (large exploding star), but rather some sort of energy release which we don't understand yet.

"We're really giving added weight to the big bang theory. But it is an infinitely more complex process than the originators conceived it to be."

BACKGROUND RADIATION

The two scientists base their ideas on readings of background radiation detected by sensitive instruments aboard a NASA U-2 aircraft at an altitude of 20,000 metres. This plane, a type most famous for spy flights over the Soviet Union and Cuba in the late 1950s and early 60s, is also used for agricultural and earth resources photography, NASA said.

Background microwave radiation, discovered in 1965, is thought to be the heat left over after the bang.

But the U-2 flights found that the radiation was the same in all sectors of the sky, indicating there is no central core of the universe and hence no single primal explosion at one "spot"

The radiation is so regular that it allows the measurement of motion of heavenly bodies, just as resistance to water allows a ship's speed to be measured.

And these measurements reveal one exception to reregularity: the earth, our solar system and our galaxy — the Milky Way—are out of step with the rest of the Hydra at more than one million miles per hour.

"This is a slight paradox, Dr. Smoot said. "Because if our galaxy was constant with the rest of the universal expansion, it should only be travelling at about one-sixth that rate of speed."

Why the Milky Way is acting this way remains unknown, though Dr Bernard Jones of England's Cambridge Institute of Astronomy has suggested that the entire universe might be slightly lop sided, with more matter on one side than on the other.

The gravity of this matter could be tugging the Milky Way, but in that case other galaxies would be affected.

The fact remains that the two scientists found none of the swirls of radiation a chaotic explosion might have caused.

The basic Smoot-Muller model of the universe is one of clusters of galaxies moving away from one another at a constant rate towards the end of the universe—if it has ends.

The model, mere complex than idea of a messy explosion, still leaves the basic question unanswered: how did the original bang come about?

Some astronomers speculate that it was caused by the collision of matter and anti-matter. This theory holds that there was originally silghtly more matter than anti-matter, so some matter was left over after the blast.

THE TIMES OF INDIA.
DECEMBER 11, 1977

کائنات کی ابتدا منظم منصوبہ کے تحت ایک طاقت کے اخراج سے ہوئی، یہ ایک انتہائی پیچیدہ نوعیت کا واقعہ تھا جس کے بعد اس کے تمام اجزار بالکل یکساں رفتار سے چاروں طرف پھیلنے لگے۔ مگر ہمارا شمسی نظام ایک حیرت انگیز استثنار ہے جو اپنی الگ رفتار سے چل رہا ہے ——————

اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ یہ کائنات کوئی الل ٹپ حادثہ نہیں، بلکہ ایک باشعور ارادہ ہے جو اس کے پیچھے کام کر رہا ہے۔

موجودہ زمانہ کے فلکیاتی نظریات میں سے ایک نظریہ وہ ہے جس کو بگ بینگ کہا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً پندرہ بلین سال پہلے کائنات ایک سمٹے ہوئے واحد مادہ کی صورت میں تھی۔ یہ ابتدائی مادہ جس کو بعض سائنس دانوں نے "سپر ایٹم" کا نام دیا ہے، اس کے تمام اجزار اندر کی طرف شدت سے کھنچے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس ابتدائی مادی مجموعہ میں زبردست دھماکا ہوا۔ اس دھماکہ کے نتیجے میں اس کے اجزار چاروں طرف پھیلنے لگے اور بالآخر موجودہ کائنات، اپنے تمام ستاروں اور سیاروں سمیت بن گئی۔

حال میں کیلی فورنیا کے دو سائنس داں ایسے نئے حقائق تک پہنچے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا دھماکہ (بگ بینگ) اس سے بہت زیادہ پرسکون اور منظم واقعہ (ORDERLY EVENT) تھا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ امریکی ادارہ ناسا کے ایک اعلامیہ میں ڈاکٹر ریکارڈ ملر اور ڈاکٹر جارج اسموٹ (کیلی فورنیا یونیورسٹی) نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیق میں پایا کہ کائنات اپنے چاروں طرف بالکل یکساں رفتار سے پھیل رہی ہے۔

اکثر سائنس داں یہ یقین رکھتے ہیں کہ کائنات ایک عظیم دھماکہ سے شروع ہوئی۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ ایک منتشر حالت تھی جس سے مادہ میں ایک بھنور کی کیفیت پیدا ہوئی۔ مگر جدید شواہد بظاہر بتا رہے ہیں کہ معروف معنوں میں یہ کوئی "دھماکہ" نہیں تھا۔ بلکہ اخراج طاقت (ENERGY RELEASE) کا ایک پرسکون واقعہ تھا جس کی حقیقت ابھی ہم سمجھ نہیں سکے ہیں۔ یہ اس سے بہت زیادہ پیچیدہ واقعہ تھا جیسا اب تک سمجھا جاتا رہا ہے۔

دونوں سائنس دانوں کے نظریات کی بنیاد وہ بیک گراؤنڈ شعاعیں ہیں جو ناسا کے یو۔ ۲ جہاز میں لگے ہوئے نازک آلات نے پتہ کی ہیں۔ یہ مخصوص جہاز ۲۰ ہزار میٹر کی بلندی تک اڑایا گیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شعاعیں ابتدائی دھماکہ کے وقت نکلی تھیں۔ ان شعاعوں کا علم ابتداءً ۱۹۶۵ میں ہوا تھا۔ یو۔ ۲ جہاز

نے معلوم کیا ہے کہ یہ شعاعیں کائنات کے ہر حصہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اتنی نظم و ترتیب ہے کہ ان کے ذریعہ آسمانی اجرام کی رفتار کو نہایت صحت کے ساتھ ناپ کر معلوم کیا جاسکتا ہے۔

تاہم جو پیمائش کی گئی ہے، ان سے نظم وضبط میں ایک استثنار کا علم ہوا ہے۔ زمین، ہمارا شمسی نظام اور ہماری کہکشاں، جس میں شمسی نظام واقع ہے، بقیہ اجرام سماوی کے مقابلہ میں ایک ملین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ "یہ صورت حال ہمارے مسلمات کے کسی قدر خلاف ہے۔" ڈاکٹر اسموٹ نے کہا "کیوں کہ اگر ہماری کہکشاں بقیہ کائناتی توسیع کے ہم آہنگ ہو تو اس کو موجودہ رفتار کے مقابلہ میں ½ رفتار سے سفر کرنا چاہئے۔" ہماری کہکشاں کیوں اس طرح استثنائی انداز سے سفر کر رہی ہے، اس کی وجہ ہم نہیں جانتے۔ اس بنیادی سوال کا جواب بھی ابھی تک لامعلوم ہے کہ کائنات کے مادہ میں ابتدائی حرکت یا دھماکہ کا آغاز کیوں کر ہوا۔

میں نے سمجھا تھا ---

- میں نے سمجھا تھا کہ دلیل میں وزن ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ طاقت اپنے اندر اس سے بھی زیادہ وزن رکھتی ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ کارکردگی سے انسان تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ لیاقت کا سب سے بڑا سرٹیفکٹ موقع پرستی ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ عہدے اور مناصب کام کرنے کے مواقع ہیں مگر معلوم ہوا کہ یہ سب محض اعزاز کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں وہی ان کے دل میں بھی ہوتا ہے مگر معلوم ہوا کہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ مقاصد کے علم بردار ہیں مگر معلوم ہوا کہ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے سوا لوگوں کو کسی چیز سے دل چسپی نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ جو لوگ خدا کی باتیں کرتے ہیں وہ خدا سے ڈرتے بھی ہیں مگر معلوم ہوا کہ خدا ان کے لئے ایک تجارتی عنوان کے سوا اور کچھ نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ اصلاح چاہتے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اپنا مفاد عزیز ہے خواہ وہ دوسروں کو برباد کر کے ہی کیوں نہ حاصل ہو۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ خدمت خلق کے لیے سرگرم ہیں مگر معلوم ہوا کہ ساری سرگرمیاں اپنے جاہ اور مفاد کے لئے کی جاتی ہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا خیر خواہ ہے مگر معلوم ہوا کہ ہر ایک دوسرے کا استحصال کر رہا ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ جنت کا راستہ وسیع اور جہنم کا راستہ تنگ ہے مگر معلوم ہوا کہ سب سے وسیع راستہ وہ ہے جو جہنم کی طرف جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات : ایک فکری مطالعہ

ایچ۔اے۔کریبس (H.A.KREBS) نے نوبل انعام پانے والوں کے علمی حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک سائنس داں کو جو چیز نوبل انعام پانے کے قابل بناتی ہے، وہ دراصل کسی بڑے سائنس داں کی صحبت ہے۔ یہ بڑا سائنس داں اپنے شاگرد کو معلومات کا ڈھیر یا ساز وسامان کا انبار نہیں دیتا۔ بلکہ ایک سائنسی روح (SCIENTIFIC SPIRIT) اور ذہنی رجحان (ATTITUDE OF MIND) اس کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس اسپرٹ یا رجحان کی روشنی میں وہ اپنا سائنسی عمل جاری رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ سائنس داں بن کر نوبل انعام پانے کا مستحق بن جاتا ہے۔

یہی بات، بلاتشبیہہ، اسلام کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ طبیعیات میں مہارت حاصل کرنے کی جو شرط ہے، وہی الٰہیات میں گہری معرفت حاصل کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اسلام کے ذریعہ انسان کو جو چیز ملتی ہے، وہ قوانین وضوابط کے مجموعہ سے زیادہ ایک ذہن اور مزاج ہے۔ یہ ذہن اور مزاج جب کسی کے اندر پیدا ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کے تمام رویوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور بالآخر اس کو خدا کی اس ابدی جنت تک پہنچا دیتا ہے جو کسی انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اس سلسلے میں یہاں ہم اسلام کے چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

تصوراتی عبادت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے جب پہلا انسان بنایا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے آگے جھک جائیں۔ یہ دراصل اس بات کی علامت تھی کہ انسان کو اس کائنات میں برتر مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کو یہ برتری، قرآن کے مطابق، اس لئے حاصل ہے کہ اس کو علم اسمار دیا گیا ہے۔ یعنی وہ اسمار (ناموں) کے ذریعہ مسمّیات (چیزوں) کو جانتا ہے، جب کہ فرشتے مسمیات کے ذریعہ مسمیات کو جانتے ہیں۔ (بقرہ - ۳۱) انسان کے اندر یہ مخصوص صلاحیت ہے کہ وہ کسی چیز کو سوچ کر جان لیتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ حسی طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہو۔ اس کے برعکس فرشتے چیزوں کو اس لئے جانتے ہیں کہ وہ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، انسان کو تصوراتی علم حاصل ہے اور فرشتوں کو مشاہداتی علم۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کو انسان سے کیا مطلوب ہے اور فرشتوں سے کیا مطلوب ہے۔ انسان سے تصوراتی عبادت مطلوب ہے اور فرشتوں سے مشاہداتی عبادت۔ فرشتے جس خدا کو دیکھ کر اس کی تسبیح وتقدیس کر رہے ہیں، انسان کو اسی خدا کی تسبیح وتقدیس دیکھے بغیر کرنا ہے۔

علم کا آغاز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو شعور کی اس سطح پر لائے جہاں وہ دیکھے بغیر حقائق کا ادراک کر سکے۔ بہت سے

جانوروں کی ساخت ایسی ہے کہ وہ اپنی سونگھنے کی صلاحیت کے ذریعے واقعات کو جانتے ہیں، اگر وہ آنکھ کے ذریعہ جاننے پر اصرار کریں تو وہ چیزوں سے باخبر نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح انسان کی تخلیق کچھ اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ وہ گہری باتوں کو اپنے ذہن کے ذریعہ ہی جان سکتا ہے۔ اگر وہ دیکھنے اور چھونے کی حد تک اپنے علم کو محدود کرلے تو وہ تمام اہم باتوں کو جاننے سے محروم رہے گا۔

تصوراتی عبادت کا ایک پہلو اور ہے۔

ایک معمولی آدمی کے مقابلہ میں ایک مشہور قائد کا استقبال کیوں زیادہ ہوتا ہے جب کہ دونوں میں ظاہری طور پر کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی وجہ قائد کی وہ غیر مرئی حیثیت (امیج) ہے جو اس کے اعمال اور اس کی قربانیوں سے اس کی شخصیت کے گرد بنی ہے۔ یہ امیج محسوس شکل میں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ محض تصوراتی چیز ہے۔ مگر یہ تصوراتی حقیقت اتنی اہم ہے کہ ہر جگہ اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔ کوئی اس کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

اسی طرح آدمی کی ایک اور امیج بن رہی ہے۔ یہ اخروی امیج ہے۔ موجودہ دنیا میں ایک شخص کے کارناموں کی امیج اس کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے بنتی ہے۔ اگلی دنیا میں اسی کے ساتھ اعمال کے حقیقی اور باطنی پہلو کے اعتبار سے اس کی امیج بن رہی ہے۔ مثلاً ایک قائد ایک عالی شان تقریر کرتا ہے یا ایک انقلابی منصوبہ بناتا ہے۔ اس کے اس عمل کا دنیوی پہلو یہ ہے کہ قائد کو اخبارات کے صفحہ اول پر جگہ مل جائے۔ اس کو ہر طرف اعزازات اور استقبالئے ملنے لگیں۔ مگر جہاں تک اخروی پہلو کا معاملہ ہے، اس کا تعلق آدمی کی نیت سے ہے۔ کوئی شخص اپنی نیت میں جتنا خالص ہوگا، اسی کے بقدر خدا کے یہاں اس کی حیثیت قائم ہوگی اور اس کی اخروی امیج بنے گی۔ دنیوی امیج کا فائدہ دنیا میں مل جاتا ہے، اخروی امیج کا فائدہ مرنے کے بعد سامنے آئے گا۔

تصورات کی دنیا (آئیڈیل ورلڈ) ہماری محسوس دنیا (میٹیریل ورلڈ) سے زیادہ حقیقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے جو عمل مطلوب ہے، وہ بھی اپنی آخری صورت میں تصوراتی ہے۔ ہم اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک تصوراتی (حیاتی) مخلوق ہیں، اس لئے ہمارا اعلیٰ ترین عمل بھی تصوراتی ہی ہوسکتا ہے۔

خدائی اور بندگی کی دریافت

مومن در اصل وہ ہے جو اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ و بالا کردیں۔ کافر اور مومن کا فرق، باعتبار حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کافر دنیا کی سطح پر جیتا ہے اور مومن آخرت کی سطح پر۔ ایک، ظاہر حیات میں گم رہتا ہے۔ دوسرا، آخر حیات میں اپنے لئے زندگی کا راز پالیتا ہے:

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (روم — ۷)

وہ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ وہ آخرت کی خبر نہیں رکھتے۔

اس کائنات میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں ہے، وہ آخرت ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ زمین و آسمان میں بوجھل ہو رہی ہے۔ حاملہ کے پیٹ میں پورا حمل جس طرح بظاہر دکھائی نہ دینے کے باوجود اس کے پورے وجود سے بول رہا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت باہر آجائے گا۔ ایسے ہی آخرت ساری کائنات میں اس طرح ابلی پڑ رہی ہے کہ ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ ظاہری پردہ پھٹ جائے اور آخرت اپنے تمام لوازم کے ساتھ سامنے آجائے۔

ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً — وہ زمین و آسمان میں بوجھل ہو رہی ہے۔ وہ اچانک آجائے گی۔ اعراف — ۱۸۷

قرآن میں مومن کی جو تصویر دی گئی ہے، وہ یہ کہ آخرت کے اس بظاہر چھپے ہوئے واقعہ کو وہ اپنی کھلی ہوئی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔ آخرت کا خیال اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتا ہے کہ ہر طرف اس کو بس آخرت ہی آخرت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہر واقعہ اس کو آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ اس کی پوری زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جاتا ہے۔

دنیا میں ایک شخص سے جو زندگی مطلوب ہے، وہ حقیقۃً یہ نہیں ہے کہ آدمی یہاں کچھ خاص طرح کے عملی رسوم ادا کرلے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اس کے سامنے آجائے۔ بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں زندگی گزارنے لگے۔ وہ آج ہی اس دنیا میں سانس لینے لگے جہاں اس کو کل پہنچنا ہے، آدمی جب "تصوراتی عبادت" کے مقام کو پہنچتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو بھی پالیتا ہے اور اپنے خدا کو بھی۔ اسلام اس کے لئے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کی یافت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

خدا اپنی پوری شان کمال کے ساتھ کائنات میں ظاہر ہوا ہے۔ خدا کی بے پایاں وسعتیں اس کی عظمت کا حال بیان کر رہی ہیں۔ سورج کی تابانیاں اس کے نور کو ہر طرف بکھیر رہی ہیں۔ زمین کا سرسبز و شاداب کرہ اس کی رحمتوں کی کہانی سنا رہا ہے۔ ستاروں کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے ہولناک عذاب کی چتاونی دے رہی ہے۔ غرض ذرہ سے لے کر کہکشانی نظاموں تک ہر چیز خدا کی بے پایاں ہستی کا تعارف ہے۔ اسلام کو پانے کا مطلب خدا کو اس کی کائنات میں دیکھ لینا ہے۔ جب آدمی حقیقی طور پر مومن بن جائے تو زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلا ہوا یہ عالم اس کے لئے خدا کے جلال و جمال کا آئینہ بن جاتا ہے۔ مخلوقات کے پردہ میں وہ خالق کو اس طرح پالیتا ہے کہ بقیہ تمام چیزیں اس کے لئے سایہ کی مانند ہو جاتی ہیں۔ خدا سب سے زیادہ حقیقی وجود کی حیثیت سے اس کے قلب و نظر کا مرکز بن جاتا ہے۔

دوسری طرف یہی یافت اس کو یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ کس قدر حقیر اور کمزور ہے۔ وہ دیکھنے لگتا ہے کہ اس کائنات میں جو تقسیم ہے وہ عجز اور اختیار کی ہے نہ کہ خود اختیاری کی۔ یہاں سارا اختیار ایک طرف ہے اور سارا عجز دوسری طرف۔ اختیار و اقتدار کی تمام قسمیں خدا کی طرف ہیں، اور عجز و ناداری کی تمام صورتیں انسان کی طرف۔ یہ دریافت اس کے اندر عاجزی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ اس کو اس حقیقت واقعہ سے باخبر کرتی ہے کہ وہ ایک حقیر وجود ہے۔ حدیث کے الفاظ میں وہ پکار اٹھتا ہے:
خدایا تمام انسان بھوکے ہیں الا یہ کہ تو انھیں کھانا کھلائے، تمام انسان ننگے ہیں الا یہ کہ تو انھیں کپڑا پہنائے۔ تمام انسان پیاسے ہیں الا یہ کہ تو انھیں پانی پلائے۔ تمام انسان بے سایہ ہیں الا یہ کہ تو انھیں اپنے سایہ میں جگہ دے۔

عجز کا یہ مقام دراصل انسانیت کی پہچان کا مقام ہے۔ جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس عظیم کائنات میں اب تک وہ بے جگہ تھا۔ اب اس نے اپنی جگہ پالی۔ وہ وہاں پہنچ گیا جہاں دراصل اس کو ہونا چاہئے۔

آخرت پسندانہ ذہن:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کا جو تصور دیا ہے، وہ آپ کے لفظوں میں مختصر طور پر یہ ہے:

الدنیا مزرعة الآخرة — دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی دنیا ہی کو اپنی کھیتی، بالفاظ دیگر، اپنی کوششوں کا حاصل پانے کی جگہ سمجھتا ہو۔ اس کی سرگرمیوں کا رخ موجودہ دنیا کی طرف ہو جائے —— وہ اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگا ہوا ہو۔ اس کو اپنے مادی مفادات سے دلچسپی ہو۔ وہ انھیں چیزوں کے لئے متحرک ہوتا ہو جس میں اس کے دنیوی معاملات درست ہوتے ہوں۔ جس میں اس کی شخصیت چمکتی ہو۔ جس میں اس کی "انا" کو تسکین ملتی ہو۔

اس کے برعکس اسلامی زندگی آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) ہوتی ہے۔ مومن کی دلچسپیوں کا مرکز وہ دائمی زندگی ہوتی ہے جو مرنے کے بعد سامنے آنے والی ہے۔ وہ ہمیشہ اخروی مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کو خدا کے یہاں سرخرو ہونے کا شوق رہتا ہے نہ کہ دنیا میں باعزت زندگی بنانے کا۔ اس کی توجہ، اس کی تمنائیں، اس کی سرگرمیاں، سب آخرت کے گھر کو بنانے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ غیر مومن دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور مومن آخرت میں۔ غیر مومن مرنے کے بعد آخرت کے عالم کو جانے گا۔ اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

میڈیکل سائنس کا ایک طالب علم اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں تعلیم و تربیت کے ایک نظام میں داخل ہو کر اپنے آپ کو تیار کرتا ہے تاکہ اپنی عمر کے بقیہ حصہ میں کامیاب ڈاکٹر بن کر باعزت زندگی گزار سکے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں خدا پرستانہ زندگی اختیار کر کے ہمیں اپنے اندر وہ "انسان" تعمیر کرنا ہے جو موت کے بعد آنے والے مرحلۂ حیات میں عمدہ زندگی پانے کا اہل ثابت ہو:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْكُم مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل۔ ۹۷)

تم میں سے جو کوئی اچھا کام کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اور وہ ایمان والا ہو، تو ہم اس کو جلائیں گے اچھا جینا۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے غلط روش اختیار کی۔ وہ آخرت میں اپنے آپ کو ایک پُرعذاب زندگی میں گھرا ہوا پائیں گے جس سے نکلنے کی کوئی سبیل ان کے پاس نہ ہوگی:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا — طٰہٰ —— ۱۲۴

اور جس نے میری یاد دہانی سے منہ پھیرا تو اس کو ملے گی ایک تنگ گزران۔

آخرت کی انھیں دونوں زندگیوں کو جنت اور جہنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جنت اور جہنم نہ کوئی طلسماتی چیزیں ہیں اور نہ

محض روحانی چیزیں۔ وہ زندگی بھی دنیا ہی کی قسم کی ایک زندگی ہوگی۔ دونوں اسی آرام اور تکلیف کے زیادہ کامل مقامات ہیں جن کا ایک ابتدائی نمونہ ہم کو آج کی دنیا میں دکھائی دے رہا ہے۔ قرآن میں جنت کے لذیذ پھلوں کو دنیا کے پھلوں کے ہم شکل بتایا گیا ہے (بقرہ ـ ۲۵)۔ اسی طرح جہنم کی زندگی کی تشبیہ اس شخص کی زندگی سے دی گئی ہے جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ ہو اور وہ اس کے بڑھاپے کے وقت جل کر تباہ ہو جائے (بقرہ ـ ۲۶۶) موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص اپنی عمر کے ابتدائی مرحلہ میں اپنے اندر تعمیری اہلیت پیدا کرتا ہے، وہ بعد کو زندگی کے میدان میں اس کی قیمت پاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے ابتدائی اوقات کو کھیل تماشوں میں گنوا دیتا ہے، وہ بعد کو اس حادثہ سے دوچار ہوتا ہے کہ دنیا کے مواقع سے اپنا حصہ وصول کرنے کی استعداد اس کے اندر نہیں ہوتی۔ ٹھیک یہی حال زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت کا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا
شمس ـ ۱۰

آخرت میں وہ شخص کامیاب رہے گا جس نے اپنے جی کو سنوارا۔ اور وہ شخص نامراد ہوگا جس نے اس کو بگاڑا۔

دنیا میں عمل کے دوران ہر آدمی اپنے آپ کو کسی نہ کسی ڈھنگ سے تیار کر رہا ہے۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کا طریقہ اپناتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اندر ایک ایسی شخصیت تعمیر کر رہے ہیں جو ایسے ماحول میں خوب ترقی کرے جہاں اخلاقی شعور ہو، حق پرستی ہو، احساس ذمہ داری ہو، ظواہر کے مقابلہ میں جواہر کی قدر ہو، سطحی باتوں کے بجائے اعلیٰ حقائق کی اہمیت ہو، خود غرضی کے بجائے اصول پسندی آدمی کی ترقی کا زینہ بنتا ہو۔ عصبیت کے بجائے حقیقت کی بنیادوں پر فیصلے ہوتے ہوں، لفظی جدال کے بجائے علمی استدلال اپنے اندر وزن رکھتا ہو۔ ایسے لوگ ممکن ہے دنیا کے اندر ناکام ہو جائیں۔ کیونکہ یہاں انسانی اقتدار اکثر فساد برپا کئے ہوئے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس قسم کی صلاحیت والے لوگ اس دنیا میں بے جگہ ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ ان کو ناگزیر معاش حاصل کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے، مگر جیسے ہی یہ زمین و آسمان بدلے جائیں گے (ابراہیم ـ ۴۸) اور براہ راست خدائی اقتدار کے تحت معیاری دنیا کی تشکیل ہوگی، یہی لوگ دنیا کے سردار بن جائیں گے۔ جو صلاحیتیں انھوں نے پچھلے پر مشقت حالات میں پیدا کی تھیں، وہی اس نئی دنیا میں عزت اور آرام کے مواقع پر قبضہ کرنے کی یقینی ضمانت ہوں گی۔

اس کے برعکس جس نے خدا کے بتائے ہوئے راستہ کو نہیں اپنایا، جس کا حال یہ رہا کہ وہ برتر تقاضوں کے بجائے وقتی محرکات کے پیچھے دوڑتا رہا۔ جس نے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کی کہ ابن الوقتی، جوڑ توڑ، خوشامد، سطحیت، استحصال، عصبیت اور مفادات کی پرستش کے ذریعہ اپنا کام بنائے، جس نے اس فن میں مہارت حاصل کی کہ وہ اپنی ہر غلطی اور بے ہودگی کو خوب صورت لفظوں میں چھپا سکتا ہے، ایسا شخص دنیا میں ہو سکتا ہے خوب نمایاں ہو جائے۔ کیونکہ یہاں اکثر اوقات ایسا ماحول چھایا رہتا ہے جس میں اس قسم کی صلاحیتوں کو بہت جلد اپنی قیمت مل جاتی ہے۔ مگر جب وہ آخرت کے عالم میں پہنچے گا تو یکایک وہ محسوس کرے گا کہ یہاں اس کے لئے مواقع حیات بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ یہاں ان صلاحیتوں کی کوئی قیمت نہیں جو اس نے دنیا میں اپنے اندر پیدا کی تھی۔

اپنے خول سے باہر آنا

قرآن میں کہا گیا ہے کہ "زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کی تسبیح کر رہی ہیں۔ مگر لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے (اسراء ۔ ۴۴)۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی کے ذریعے جو حقیقت لفظوں میں بیان کی گئی ہے اسی کی آواز ساری کائنات میں غیر ملفوظ شکل میں بلند ہو رہی ہے۔ پھول اسی کی خوشبو اور رنگینی بکھیر رہے ہیں۔ ہوا اسی پیغام کو لے کر چل رہی ہے۔ ستارے اسی کی خبر رسانی کے لئے روشن ہیں۔ آسمان اسی کے اعلان کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ درخت اور پہاڑ اور سمندر، تمام چیزیں اسی کے ابدی نغمے ہر آن نشر کر رہے ہیں۔ مگر یہ سب چیزیں خاموش زبان میں ہیں۔ انسان چونکہ اپنے آپ میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ چپ کی زبان کو سن نہیں پاتا۔ اس لئے خدا کو نطق کی زبان میں اپنا کلام اتارنا پڑا۔

مگر قرآن حقیقتہً غیر ملفوظ نشریات الٰہی کو سننے کے لئے ایک ملفوظ رہنما ہے۔ خدا کو کوئی شخص اسی وقت پاتا ہے جب کہ وہ خاموش وحی کو سننے لگے، جب چھپی ہوئی کائنات میں وہ خدا کو دیکھنے لگے۔ جب غیر محسوس دنیا میں وہ اپنے لئے زندگی کا سامان پالے۔ یہ مقام آدمی کو اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ مادیات سے اوپر اٹھ جائے۔ جب وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آکر سانس لینے لگے۔

یہ معرفت کی وہ سطح ہے جہاں اپنی سطح پر جینے کا نام کفر اور خدا کی سطح پر جینے کا نام اسلام ہوتا ہے۔ جب آدمی اپنے اوپر اس حد تک قابو پالے کہ اپنے آپ کو اپنے لاشعور سے جدا کر کے دیکھ سکے تو وہ اپنے آپ کو پالیتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور زندگی شروع ہوتی ہے۔ وہ لاشعور کے زیر اثر زندگی گزارنے کے بجائے شعور کے تحت زندگی گزارنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے باہر آکر اپنے آپ کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے گزر کر خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

ہر آدمی جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، بہت جلد اس کے گرد افکار اور جذبات کا ایک خود ساختہ خول بن جاتا ہے اس فطری فکری خول سے دھیرے دھیرے وہ اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ اس کو وہ حقیقت کے روپ میں دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی احساس کو خارجی حقیقت کے ہم معنی سمجھ لیتا ہے۔ کسی آدمی کے لئے سچائی تک پہنچنے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ جب تک وہ اس خول کے اندر ہے، وہ صرف اپنے آپ کو جانتا ہے۔ اس خول سے نکلنے کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اور برتر ہستی ہے جو اس کی اپنی ذات کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی ہے۔ وہ زوال کے مقابلہ میں کمال سے آشنا ہوتا ہے، وہ عجز کے مقابلہ میں قدرت کو پالیتا ہے۔

اب آدمی کی سوچ اور چاہت کا مرکز اس کی ذات کے بجائے خالق کی ذات بن جاتی ہے۔ وہ اپنی پرستش کے دائرہ سے نکل کر خدا کی پرستش کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بلند ہو کر اپنے رب کو پالیتا ہے ـــ آدمی جب تک اپنی ذات کے خول سے نہ نکلے وہ نہ اپنے آپ کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنے خدا کو۔

نفسیاتی گرہوں سے آزاد انسان :

خدا کا وہ بندہ جس سے خدا خوش ہوگا اور اس کو اپنی جنت میں داخل کرے گا، اس کو قرآن میں نفس مطمئن (فجر ۲۷)

کہا گیا ہے۔ نفس مطمئن سے مراد پیچیدگیوں سے آزاد روح (COMPLEX-FREE SOUL) ہے۔ آدمی اس دنیا میں جو رویہ ظاہر کرتا ہے، وہ کچھ نفسیاتی پیچیدگیوں کے تحت ہوتا ہے۔ کچھ دنیوی کامرانی حاصل ہو جائے تو وہ اپنے کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ دنیوی محرومی لاحق ہو تو احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی سے دل چسپی ہو تو آدمی کو اس کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔ کسی سے ان بن ہو جائے تو اس کی ہر بات آدمی کو الٹی دکھائی دیتی ہے۔ جس سے کوئی امید وابستہ ہو، اس کے آگے آدمی جھکتا ہے۔ جس سے کسی نفع کی امید نہ ہو، اس سے بے نیازی برتتا ہے۔ جس محفل میں آدمی کی "انا" کو تسکین ملے، وہاں وہ خوب اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ جہاں انا کو تسکین ملنے والی نہ ہو، وہاں جانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔ یہ سب زیادہ تر لاشعور کے تحت ہوتا ہے۔ مختلف عوامل کے اثر سے آدمی کا جو ایک ذہن بن جاتا ہے، اس کے تحت وہ تمام کام کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کے ہالہ سے باہر آ کر خالص بے آمیز شکل میں رائے قائم نہیں کر پاتا۔ اس کا ہر رویہ متاثر ذہن کے تحت نکلا ہوا رویہ ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً آزاد رویہ۔

ایمان لانا گویا اپنے آپ کو ہر قسم کے اضافی محرکات اور مصنوعی رجحانات سے اوپر اٹھانا ہے۔ جب آدمی حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرتا ہے تو وہ نفسیاتی گرہوں سے آزاد انسان بن جاتا ہے۔ وہ خالص فطری حالت میں اشیاء کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن میں نفس مطمئن کہا گیا ہے۔ یہ مقام کسی کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک وہ دنیوی علائق اور مادی محرکات سے اوپر نہ اٹھ جائے۔ حتیٰ کہ وہ ان داعیات کو بھی دیکھنے لگے جو لاشعور کے تحت عمل کرتے ہیں اور عام حالات میں خود متعلقہ شخص کو بھی ان کی خبر نہیں ہوتی۔ جب تک ایسا نہ ہو، خدا کے ساتھ آدمی کا ملن نہیں ہو سکتا۔ خدا کی شان صمدیت ہے۔ وہ ہر قسم کی پیچیدگیوں سے ماورا ہے۔ وہ واقعات کو ان کی بے آمیز صورت میں دیکھتا ہے۔ اس لئے خدا کی معیت اسی بندے کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنے اندر اس اخلاقِ خداوندی کو پیدا کرے۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنے لاشعور کی گرہوں میں پھنسا ہوا ہو، جو اپنی ذات کے مدار سے باہر نہ نکل سکے، وہ خدا کو نہیں پا سکتا، وہ "خدا کے ساتھ چلنے والا" نہیں بن سکتا۔

نفس مطمئن کے مقام پر پہنچنے کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو حدیث میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله — مومن کی ہوشیاری سے بچو، کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔

جب آدمی نفسیاتی گرہوں سے آزاد ہو جائے تو وہ حالت فطری کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ مکمل طور پر بے آمیز رائے قائم کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ وہ محبت اور نفرت، خوف اور امید، عزت اور بے عزتی، فائدہ اور نقصان کے احساسات کے تحت نہیں سوچتا۔ وہ ان تمام محرکات سے اوپر اٹھ جاتا ہے جو آدمی کے گرد ہالہ بن کر اس کی عقل کو گھیر لیتے ہیں اور اس کو صحیح رائے تک پہنچنے نہیں دیتے۔ ایسا شخص معاملات میں مکمل طور پر غیر جذباتی اور حقیقت پسندانہ رائے قائم کرتا ہے۔ اس کی نگاہیں تمام مصنوعی دیواروں کو توڑ کر حقائق کو دیکھ لیتی ہیں۔ وہ واقعات کا مشاہدہ اس سطح سے کرنے لگتا ہے جہاں سے خدا کامل اور ابدی شکل میں ان کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اس مقام پر پہنچ جائے، اس کی رائے لازماً صحیح ہوگی۔ اور

جو شخص صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کرے، اس کی طاقت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔

رزقِ رب :

ایمان زندگی کی حالت ہے اور کفر موت کی حالت (انعام ۔ ۱۲۲) ہر آدمی حقیقۃً ایک مردہ آدمی ہے، وہ زندہ آدمی اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ ہدایت کی روشنی کو پالے۔ جب خدا کی طرف سے اس کو رزق رب پہنچنے لگے۔ (طٰہٰ ۔ ۱۳۱)

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رزق کے دو دسترخوان کھولے ہیں۔ ایک مادی دسترخوان جس میں غلہ اور سبزی اور پھل اور گوشت جیسی چیزیں ہیں۔ یہ حیوانی رزق ہے۔ اس رزق میں حصہ پانا ایسا ہی ہے جیسے کسی جانور کو ایک اچھی چراگاہ مل جائے یا کسی بھیڑیے کو اپنے ناشتہ کے لئے عمدہ گوشت حاصل ہو جائے۔ اگر کسی نے اپنے لئے ہر قسم کے رزق مادی جمع کر لئے ہوں تو یہ زیادہ سے زیادہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے حیوانی سطح کو پالیا ہے۔ مگر اعلیٰ انسانی سطح کا درجہ اس سے آگے ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو خدا سے رزق ملنے لگے۔ جب مخلوقات کے بجائے خود خالق اس کے لئے رزق کا سرچشمہ بن جائے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا :

ان ربی یطعمنی ویسقینی   میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی کسی نہ کسی رزق پر جی رہا ہے۔ رزق کے بغیر زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ایمان اور کفر کی تعریف، اپنی حقیقت کے اعتبار سے کی جائے تو وہ یہ ہوگی ——— کفر کی حالت یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا کے مادی رزق پر جی رہا ہو۔ اور اسلام کی حالت یہ ہے کہ آدمی اپنے کو اتنا اونچا اٹھائے کہ خود خالق کائنات سے اس کو رزق پہنچنے لگے۔ فیضانِ الٰہی کی ابدی دنیا میں وہ اپنے لئے زندگی کا سامان پالے۔

خارجی ذمہ داری

دوسرے بندگانِ خدا کے سلسلے میں ایک مومن سے جو چیز مطلوب ہے، وہ نُصح (خیر خواہی) ہے۔ دنیوی معاملات میں اس خیرخواہی کا اظہار قسط (انصاف) کی صورت میں ہوتا ہے ۔ اور اُخروی معاملہ میں شہادت حق کی صورت میں۔ (نسار ۔ ۱۳۵)

قسط یہ ہے کہ ہم اپنے دوسرے بھائی کے لئے وہی چاہیں جو ہم خود اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ہم جب دوسرے کے بارے میں بولیں یا دوسرے کے ساتھ کوئی معاملہ کریں تو ہماری کارروائی ضد، عصبیت، انانیت یا انتقامی نفسیات کے زیر اثر نہ ہو بلکہ بے لاگ انصاف کے مطابق ہو۔ قرآن میں کہا گیا ہے: کسی کی دشمنی تمھیں ایسا نہ کر دے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ۔ بلکہ انصاف کرو۔ یہی روش تقویٰ سے لگتی ہوئی ہے (مائدہ ۔ ۸)۔ یہ بہترین جانچ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی قسط پر قائم ہے یا نہیں ——— جب کوئی شخص آپ کے اوپر تنقید کرے، جب کسی سے آپ کا اختلاف ہو جائے جب کسی سے آپ کو کسی قسم کی ٹھیس پہنچے، وہی وقت دراصل اس بات کی جانچ کا ہوتا ہے کہ آپ مقام قسط پر ہیں یا

مقام ظلم پر۔ مگر انسان اکثر ٹھیک اسی مقام پر ناکام ہوجاتا ہے جہاں اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے
خیر خواہی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ لوگوں تک حق کا پیغام پہنچائیں۔
رسول کی حیثیت داعی الی اللہ کی ہے۔ امت مسلمہ بھی آپ کی تبعیت میں ذمہ داری کے اسی مقام پر کھڑی کی گئی ہے (یوسف۔ ۱۰۸) دنیا میں رسول اور آپ کے تبعین کا رشتہ، دوسرے انسانوں سے، داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ آخرت میں یہ رشتہ شاہد اور مشہود کی صورت میں ظاہر ہوگا جب کہ رسول اور آپ کے پیرو خدا کی عدالت میں کھڑے ہوکر لوگوں کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انھوں نے دعوت الی اللہ کا جواب کس طرح دیا تھا۔ اللہ کے ان گواہوں کو آخرت میں سب سے اونچے مقام پر کھڑا کیا جائے گا جہاں سے وہ تمام اقوام کو دیکھیں اور ان کے بارے میں اپنا بیان دیں۔ اسی لئے قرآن میں ان کو بلندیوں والے (اصحاب اعراف) کہا گیا ہے۔ ابن جریر اور ابن المنذر نے جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن میں اور میری امت والے اونچے ٹیلوں پر ہوں گے اور اوپر سے مخلوق کو دیکھ رہے ہوں گے" پیغمبر اسلام پر چوں کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا، اس لئے آپ اپنی امت پر گواہ بنائے گئے۔ آپ کے بعد آپ کی امت کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ قیامت تک تمام انسانوں کے اوپر گواہ بنے (حج۔ آخر)
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اس ذمہ داری کا اتنا زیادہ احساس رہتا تھا کہ ہر وقت اس کے لئے دکھی رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس غم میں آپ اپنے کو ہلاک کر ڈالیں گے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ	شاید تم اس غم میں اپنے کو ہلاک کر ڈالوگے کہ لوگ ایمان نہیں لاتے
شعراء — ۳	

مکہ کے آخری دور میں جب کہ حالات انتہائی سخت ہوچکے تھے ایک طرف مخالفین کا غصہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک بار جب کہ ابو بکر صدیق خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، مخالفین نے گھیر کر آپ کو مارنا شروع کیا۔ کسی دیکھنے والے نے پوچھا یہ کون ہے۔ مارنے والوں میں سے ایک شخص نے غصہ میں کہا: مجنون بن ابی قحافہ (ابو قحافہ کا پاگل لڑکا)۔ ایک طرف یہ تھا، دوسری طرف مسلمانوں کی معاشیات مکمل طور پر برباد کردی گئی تھیں۔ زندگی کے تمام راستے ان کے لئے بند ہوچکے تھے۔ اس کے باوجود صبر و برداشت کے سوا کسی اور چیز کی اجازت نہ تھی۔ اس زمانہ میں وہ آیت اتری جو سورۂ ہود میں شامل ہے

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ	تم اور تمہارے ساتھی حکم کے مطابق قائم رہو اور حد سے نہ بڑھو۔ خدا دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور ظالموں کی طرف مت جھکو ورنہ آگ تم کو پکڑے گی۔
ہود — ۱۱۳	

ان حالات میں یہ حکم کتنا سخت تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا:

شیبتنی ھود واخواتھا	سورہ ہود اور اس کی ساتھ کی سورتوں نے مجھ کو بوڑھا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اسلام کے ماننے والوں کو اسلام کے مخالفین کے اوپر غالب کرے گا۔ یہ وعدہ جو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے، شہادت کے معاملہ ہی کا ایک پہلو ہے۔ دنیا میں اہل اسلام کا غیر اہل اسلام پر غلبہ دراصل آخرت میں ان کے اصحاب اعراف (بلندیوں والے) ہونے کا ایک دنیوی اظہار ہے۔ جب بھی خدا پرستوں کا کوئی گروہ اپنے دعوتی عمل سے شاہد آخرت بننے کا استحقاق حاصل کرتا ہے، وہ خدا کی سنت کے مطابق "فوقیت" کا درجہ پالیتا ہے۔ دوسری قوموں کے اوپر اس کی یہ فوقیت آخرت میں یقینی طور پر ظاہر ہوگی۔ اور جب خدا چاہتا ہے تو دنیا میں بھی اس کے لئے فوقیت کا فیصلہ فرما دیتا ہے (بقرہ – ۲۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ اسلام کا راستہ دعوت اسلام کی سمت سے ہو کر جاتا ہے۔ دعوتی عمل کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ اسلام کو غالب کرنے کی کوشش ایک ایسا منصوبہ ہے جو خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اسلام اور سیاست

سیاست اسلامی تحریک کا اشو نہیں، اسلامی تحریک کا ایک مرحلہ ہے جو کبھی پیش آتا ہے اور کبھی پیش نہیں آتا۔ اسلام کا خطاب "انسان" سے ہوتا ہے نہ کہ کسی سیاسی ادارہ سے۔ اس کا نشانہ "قلب" کو بدلنا ہوتا ہے نہ کہ نظام کو بدلنا۔ اسلام کا ایک علم بردار آخرت کی نجات کا پیغام لے کر اٹھتا ہے نہ کہ اقتصادی اور سیاسی نجات کا پیغام۔ یہ کہنا کہ "اسلام کا مقصد فرد سے لے کر سماج تک کی اصلاح ہے"، اسی طرح ایک بے معنی جملہ ہے جیسے کوئی باغبان یہ کہے کہ "میرا مقصد بیج سے لے کر پتی تک کو وجود میں لانا ہے"۔ اس قسم کا کوئی جملہ باغبانی کی "مکمل تشریح" نہیں ہے، بلکہ باغبانی کی صرف ناقص تشریح ہے۔ کیوں کہ باغ دراصل بیج کے تحقق کا دوسرا نام ہے نہ کہ بیج سے لے کر پتی تک کی کسی "مکمل" جدوجہد کا۔ اس قسم کے مکمل منصوبے اینٹ پتھروں کی تعمیر کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ زندہ ہستیوں کی تعمیر کے لئے۔

ایک بندۂ مومن کو جو چیز بے چین کرتی ہے، وہ یہ احساس ہے کہ اسے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ یہ احساس، عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ایک ذاتی احساس ہے۔ وہ شخصی انقلاب کا پروگرام ہے۔ مگر زندگی کی سرگرمیاں یا تمام انسانی تعلقات اشخاص ہی کے عمل کا دوسرا نام ہیں۔ اس لئے کسی معاشرہ میں جب اشخاص کی قابل لحاظ تعداد آخرت کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے لگے تو جگہ جگہ ان کا سابقہ دوسرے انسانوں سے پیش آتا ہے۔ یہ سابقہ کبھی اعتقادی بحثوں تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم کی مثال میں ہوا۔ کبھی وقت کے حکمران اور داعی کے درمیان جزوی مصالحت ہو جاتی ہے جیسا کہ حضرت یوسف کی مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ کبھی مدعو کی ضد داعی اور مدعو کے درمیان سیاسی ٹکراؤ کی صورت پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ نبی آخر الزماں کی مثال میں نظر آتا ہے۔ تاہم ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ داعی سیاسی انقلاب یا حکومتی تغیر کو اپنی دعوت کا اشو بنائے۔ سیاست اور حکومت کا انقلاب بطور ایک امکانی نتیجہ کے اسلامی تحریک کا جزو بن سکتا ہے۔ مگر وہ تحریک کا ابتدائی اور بنیادی پروگرام کبھی نہیں ہوتا۔

ایک باغبان کبھی ایسا نہیں کرتا کہ یہ اعلان کر کے فضاؤں اور بادلوں سے لڑنے لگے کہ "میرا مقصد ایک مکمل درخت کو وجود میں لانا ہے"۔ وہ زمین کو درست کرتا ہے اور بیج کی جڑ جمانے پر ساری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ اسی طرح اسلام کا داعی اگر ایسا کرے کہ وہ "مکمل انقلاب" کا نعرہ لگا کر وقت کے حکمرانوں سے لڑنا شروع کر دے کیونکہ "معاملات زندگی کی باگیں حکمراں طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں"، تو یہ ایک نادانی کا فعل ہوگا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے "معاملات کی باگیں" دنیا طلبی اور نفس پرستی کے ہاتھ میں ہوتی ہیں نہ کہ کسی سیاسی ادارہ کے ہاتھ میں۔ اسلام کی کامیابی یہ ہے کہ لوگ دنیا طلبی کو چھوڑ کر آخرت پسند بن جائیں، وہ نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی کو اپنا دین بنا لیں۔ یہی اسلام کی سیاست بھی ہے اور غیر سیاست بھی۔ اگر یہ بات حاصل ہو جائے تو گویا سب کچھ حاصل ہو گیا۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو "مکمل انقلاب" کا پروگرام لے کر سیاست کی چٹان سے سر ٹکرانا اتنا ہی بے معنی ہے جتنا "مکمل درخت" کا منصوبہ لے کر فضاؤں میں اچھل کود کرنا۔

مقصد بعثت

پیغمبر اسلام کی بعثت کا مقصد بھی ٹھیک وہی تھا جو دوسرے پیغمبروں کا تھا۔ سب کو ایک ہی دین دیا گیا۔ ان میں سے کسی کا مقصد نہ تو دوسرے سے مختلف تھا اور نہ ایسا ہوا کہ کسی کو ناقص اور کسی کو کامل دین دیا گیا ہو۔ تاہم ان میں بعض اضافی فروق تھے۔ اصل مشن کے ساتھ ہر ایک کو کوئی منفرد وظیفہ بھی عطا کیا گیا اور اس کے لحاظ سے اس کو ضروری اسباب دیئے گئے ——— حضرت ابراہیم، توحید و آخرت کے اعلان کے ساتھ اس پر بھی مامور تھے کہ صحرائے عرب میں پہنچ کر خدا کا پہلا گھر تعمیر کریں۔ حضرت موسیٰ کے ذمہ یہ کام تھا کہ اپنے اصل فریضہ (اعلان حق) کے ساتھ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باہر لے جائیں۔ حضرت مسیح اپنی پیغمبرانہ ذمہ داری کے ساتھ نبی آخر الزماں کے بشیر بنا کر بھیجے گئے، وغیرہ

پیغمبر اسلام کے معاملہ کی نوعیت بھی ٹھیک یہی ہے۔ آپ سے اللہ تعالیٰ کو اصلاً جو چیز مطلوب تھی، وہ تو یہ تھی کہ وہ دنیا کے لئے منذر و مبشر بنیں۔ اسی کے ساتھ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا منصوبہ یہ بھی تھا کہ خصوصی غیبی مدد کے ذریعہ زمین پر اہل اسلام کی حکومت قائم کر دے تاکہ آخری کتاب کی حفاظت کا انتظام ہو سکے۔

اسلام کی جو تاریخ بنی، وہ پیغمبرانہ مشن کا اضافی جزء ہونے کے باوجود کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ وہ بجائے خود مطلوب بھی تھا۔ مگر یہ مطلوبیت باعتبار وسیلہ تھی نہ کہ باعتبار مقصد۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی آخری کتاب کو محفوظ کرنا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ قرآن کے ساتھ اقتدار کو جمع کیا جائے۔ اگر پچھلی آسمانی کتابوں کی طرح قرآن کے ساتھ اقتدار کو جمع نہ کیا گیا ہوتا تو ہزاروں برس کی پیغمبرانہ تاریخ کا تجربہ بتا رہا تھا کہ اس کا انجام بھی بالآخر وہی ہوگا جو پچھلی آسمانی کتابوں کا ہوا۔ اس مصلحت کے تحت اللہ تعالیٰ نے خصوصی فیصلہ کیا کہ وہ آخری شریعت کے ساتھ لازماً اقتدار کو بھی جمع کرے گا (الدین والسلطان توأمان) خواہ یہ اجتماع شرک و کفر کے علم برداروں کو کتنا ہی ناگوار ہو (صف ۔ ۹

عرب میں جب اسلام کا غلبہ قائم ہو گیا تو سنہ ۱۰ھ میں یہ آیت اتری۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ۔۳) آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور

تمھارے اوپر اپنی نعمت تمام کردی۔

یہاں اکمال دین اور اتمام نعمت سے مراد اصلاً قانون اسلامی کی دفعات کی تکمیل نہیں ہے۔ بلکہ آخری شریعت کے ساتھ اقتدار کو جمع کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت میں اسی کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ اب عرب کی تسخیر کے بعد کافر اس سے مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ تمھارے دین کو مغلوب کر سکیں (اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ) ۔ دوسرے مقامات سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے جہاں غلبہ اسلامی کو اتمام نور (صف ۔ ۸) سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اتمام کلام الٰہی کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اب اس کلام کو کوئی بدل نہیں سکے گا (انعام ۔ ۱۱۵) اللہ تعالیٰ نے قرآن کے نزول کے بعد اس کی پشت پر وقت کی عظیم ترین سلطنت قائم کر دی۔ یہ سلطنت قرآن کو اپنے زیر حفاظت لئے ہوئے نسل در نسل چلتی رہی۔ تا آنکہ صنعتی انقلاب ہوا اور پریس کا دور آگیا اور سرے سے اس کا امکان ہی ختم ہو گیا کہ کوئی شخص یا گروہ قرآن میں تحریف کر سکے یا اس کو مٹا سکے۔

اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے عقیدہ اور تاریخ کے فرق کو سمجھنا اور دونوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہم قتال اور سیاست کے معرکے گرم کرتے رہیں گے اور سمجھیں گے کہ ہم پیغمبرانہ مشن کو زندہ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت ہم دین کو ذبح کر رہے ہوں گے۔ کیوں کہ خدا کا آخری رسول، دوسرے تمام رسولوں کی طرح، لوگوں کو آخرت کی چیتاؤنی دینے آیا تھا نہ کہ لوگوں سے سیاسی لڑائیاں لڑنے کے لئے۔ مزید یہ کہ اس قسم کا سیاسی جہاد، خود اصل مقصد (اسلام کا غلبہ) تک پہنچانے کے لئے بھی قطعاً بے سود ہے۔ کیونکہ اسلام کا غلبہ خدا کی نصرت سے حاصل ہوتا ہے (وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ) اور خدا کی مقرر کردہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر پہلے ہی ہم اس کی نصرت کا استحقاق کھو چکے ہیں۔ یہی نہیں، عین ممکن ہے کہ ہمارا یہ سیاسی جہاد ہمارے لئے دنیا و آخرت میں رسوائی کا سبب بن جائے۔ کیوں کہ دین خداوندی کو آخرت کا سوال بنانے کے بجائے سیاست کا سوال بنانا، دین کی اُلٹی شہادت دینا ہے۔ یہ آنے والی دنیا کے مسئلہ کو موجودہ دنیا کے مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی الٹی شہادت آدمی کو سزا کا مستحق بناتی ہے نہ کہ انعام کا۔

ہ (اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ) يئسوا منه ان يبطلوه اويئسوا من دينكم ان يغلبوه ، لان الله تعالى وفى بوعده من اظهاره على الدين كله (فَلَا تَخْشَوْهُمْ) بعد اظهار الدين وزوال الخوف من الكفار وانقلابهم مغلوبين بعد ما كانوا غالبين (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) بان كفيتم خوف عدوكم واظهرتكم عليهم كما يقول الملوك : اليوم كمل لنا الملك ، اى كفينا من كنا نخافه (وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ) بفتح مكة ودخولها آمنين ظاهرين وهدم منار الجاهلية ومناسكهم   تفسیر نسفی، جلد اول، صفحہ ۲۷۰

کامیابی کا راز خاموش منصوبہ بندی ہے نہ کہ پُرشور معرکہ آرائی

جنگ کو کامیاب طور پر جاری رکھنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ دشمن کو جنگ بند کرنے پر راضی کر لیا جائے

صدر مصر انور سادات کا دورۂ اسرائیل کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ جیسا کہ سابق وزیر اعظم مسز گولڈا میر نے کہا ہے، مصر اور اسرائیل کے درمیان اکتوبر ۱۹۷۳ کی جنگ کو آخری جنگ بنانے کی یہ گفت گو پچھلے تین سال سے جاری تھی۔ ۱۹ نومبر ۱۹۷۷ کو مسٹر سادات کا یروشلم میں اترنا صرف اس کا آخری نتیجہ تھا۔

دشمن سے صلح کرنا، جنگ کو زیادہ بہتر طور پر جاری رکھنے کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ مگر اس میں شبہ ہے کہ اقتصادی حیثیت سے برباد شدہ مصر کے حکمراں کے لئے صلح کا محرک یہی ہے۔ اگر یہ اعلیٰ محرک اس اقدام کا سبب بنا ہو تو کیا وجہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اسرائیل کی سرحد پر اپنی بندوقوں کو خاموش کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ دوسری طرف انھیں بندوقوں کا رخ انھوں نے انتہائی بے صبری کے ساتھ فلسطینیوں اور اپنے ہم قوم عربوں کی طرف کر دیا ہے۔

تاہم پرجوش عرب اور اس سے زیادہ پُرجوش فلسطینی بھی اس معاملہ میں کسی تحسین و آفریں کے مستحق نہیں ہیں۔ انور سادات نے بالفرض اگر کوئی غیر صحیح قدم اٹھایا تھا تو کیا آپ کے لئے یہی ایک صورت تھی کہ ان کے خلاف فوراً محاذ آرائی کا معرکہ گرم کر دیں۔ مفاہمت کی خاموش صورتیں تلاش کرنے کا راستہ بھی تو آپ کے لئے کھلا ہوا تھا۔

موجودہ زمانہ میں مسلم قوموں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے قائدین کو صرف ایک ہی طریقہ —— محاذ آرائی کا طریقہ —— معلوم ہے۔ خاموش جد وجہد کا سبق ان میں سے کسی نے نہیں سیکھا۔

اسرائیل کے وزیر اعظم مسٹر بیگن سے پوچھا گیا "کیا اسرائیل اس کے لئے تیار ہے کہ مقبوضہ مغربی اردن اور فلسطینیوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے گفتگو کرے"، انھوں نے جواب دیا:

WE WILL FIND A SOLUTION TO THE PALESTINIAN PROBLEM, BUT NOT IN FRONT OF THE TELEVISION CAMERAS

ہم فلسطینی مسئلہ کا حل پالیں گے۔ مگر ٹیلی وژن کیمروں کے سامنے نہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۳ دسمبر ۱۹۷۷)

قوموں کے مسائل کا حل خاموش منصوبہ بندی میں ہوتا ہے۔ مگر اکثر قائدین اس کو پُررونق ہنگاموں میں تلاش کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس طرح دو فائدوں میں سے کم از کم ایک فائدہ یقینی طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ "ہنگامہ" کے ذریعہ قائد کی اپنی شخصیت بہرحال نمایاں ہو جاتی ہے۔ خواہ قوم کا مسئلہ حل ہو یا نہ ہو۔

الرسالہ ۱۹۷۷ کے مندرجہ ذیل شمارے درکار ہیں
جنوری ، فروری ، اکتوبر ، نومبر
جو صاحبان یہ شمارے فراہم کر سکتے ہوں ، وہ براہ کرم ہم کو مطلع فرمائیں —— منیجر

عربی زبان نئی اہمیت حاصل کر رہی ہے

ہزار برس پہلے ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم تھا۔ یہ صرف ایک سیاسی غلبہ نہیں تھا۔ بلکہ مسلمان اس وقت کی دنیا میں علمی اور فکری امام بنے ہوئے تھے۔ اسپین میں مسلم عہد کے عروج کے وقت اسپینی عیسائیوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے عملاً عرب تمدن کو اختیار کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو اس زمانہ میں مستعرب (MOZARABES) کہا جاتا تھا۔

قرطبہ کے بشپ (ALVARO) نے ان عیسائی مستعربین پر افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا:

"میرے مسیحی بھائی عربی اشعار اور حکایات سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور مسلمان علماء اور فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس نیت سے نہیں کہ ان کی تردید کریں بلکہ اس ارادہ سے کہ وہ عربی کے صحیح اور شستہ طرز ادا سے آشنا ہو سکیں۔ آج کل ہماری کتب مقدسہ کی لاطینی تفاسیر کا پڑھنے والا کہاں ملتا ہے۔ اور ایسے لوگ کہاں ہیں جو اناجیل اور انبیاء کے صحف کا مطالعہ کرتے ہوں۔ افسوس کا مقام ہے کہ تمام عیسائی نوجوان جو اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں عربی زبان اور ادب کے سوا اور کسی ادب سے واقف نہیں ہیں۔ یہ لوگ عربی کتابیں بڑے ذوق شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کو اپنے کتب خانوں کے لئے زر کثیر صرف کر کے حاصل کرتے ہیں اور علانیہ کہتے ہیں کہ یہ لٹریچر بڑی تحسین کے لائق ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کے سامنے مسیحی کتابوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حقارت سے جواب دیں گے کہ اس قسم کی کتابیں ان کی توجہ کے لائق نہیں۔ افسوس کہ مسیحی اپنی زبان تک بھول گئے ہیں۔ ہزار میں سے بمشکل ایک شخص ایسا ملے گا جو معقول قسم کی لاطینی میں اپنے دوست کے نام معمولی سا خط بھی لکھ سکے لیکن اگر عربی قابلیت پوچھئے تو بہت سے ایسے اشخاص ملیں گے جو نہایت فصیح و بلیغ عربی میں اپنے خیالات ادا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس زبان میں ایسی عمدہ شاعری کرتے ہیں کہ خود عرب بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔"

یہ اقتباس اسپینی مستشرق پروفیسر پالنیا (PALENCIA) کی کتاب سے ماخوذ ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۸ میں شائع ہوا تھا۔ مصری فاضل حسین مونس نے اس کو اسپینی سے عربی میں منتقل کیا ہے۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۵ء)

تاتاریوں نے جب عالم اسلام کو تاراج کیا تو صورت حال بدلنے لگی۔ اب نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ فکری اور علمی حیثیت سے بھی مسلم قومیں پستی کی طرف چلی گئیں۔ گیارھویں

یتعلمون العربیة فی المدرسة العراقیة بباریس

٧ طالبا وطالبة انضموا من الارجنتین وهولندا وامیرکا ویوغسلافیا وبلجیکا والمانیا وفرنسا والسنغال وحتی من جزر القمر لیتعلموا اللغة العربیة فی المدرسة العراقیة بباریس موزعین علی صف متقدم واخر اولی فیها .

پیرس میں عراق کی طرف سے ایک اسکول قائم کیا گیا ہے جس میں مغربی نوجوانوں کو عربی زبان سکھائی جاتی ہے اس میں ۷۰ طلبہ و طالبات ہیں جو مختلف ملکوں، ارجنٹائن، ہالینڈ، امریکہ، یوگوسلاویا، بلجیم، جرمنی، فرانس، سینیگال وغیرہ کے ہیں۔

صدی عیسوی کے شیخ عبدالقادر جرجانی (م ۴۷۱ھ) کے قلم سے یہ الفاظ نکلے کہ اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ انسانی طبیعتیں بدل گئی ہیں۔ جہل اور لاعلمی نے علم و فضل کا درجہ لے لیا ہے۔ جو اوصاف پہلے قابلِ تعریف سمجھے جاتے تھے، وہ قابلِ مذمت بن گئے ہیں:

حتّٰی صَارَ اَعْجَزَ النَّاسِ عِنْدَ الْجَمْعِ مَنْ کَانَتْ لَہٗ هِمَّةٌ فِی اَنْ یَّسْتَفِیْدَ عِلْماً اَوْ یَزْدَادَ فَهْماً اَوْ یَکْتَسِبَ فَضْلاً اَوْ یَجْعَلَ لَہٗ ذٰالِکَ بِحَالٍ شُغْلاً۔

دلائل الاعجاز، صفحہ ۲۸

یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ لوگوں کے نزدیک وہ شخص سب سے زیادہ ناکارہ سمجھا جاتا ہے جو علوم عربیہ کا شوق رکھتا ہو۔ اور اس میں استفادہ و ترقی میں مشغول ہو۔

اٹھارویں صدی میں جب مغربی قومیں عالم اسلام پر غالب آگئیں تو اس میں اور ترقی ہوئی۔ تقریباً دو سو برس تک یہ حال رہا کہ عربی زبان اور عربی علوم میں مشغول ہونا، کم از کم دنیوی اعتبار سے، بالکل بے فائدہ سمجھا جانے لگا۔ "مسٹر" ہونا عزت کی علامت اور "مولوی" ہونا بے وقعتی کا نشان بن گیا۔ مگر بیسویں صدی کے نصف

ایک عالمی تجارتی ادارہ کا اشتہار ہانگ کانگ کے اخبار میں

لندن ٹائمس میں فروخت جائداد کا اشتہار عربی زبان میں

آخر میں صورت حال دوبارہ تبدیل ہو رہی ہے۔

ہندستان میں بہت سے ادارے ہیں جو مختلف بیرونی زبانیں سکھانے کا کورس چلاتے ہیں۔ چند برس پہلے ان میں عربی زبان کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ آج یہ حال ہے کہ بڑے بڑے انگریزی اخبارات میں جب ان اداروں کا اشتہار چھپتا ہے تو عربی زبان، مختلف غیر ملکی زبانوں کی فہرست میں صرف انگریزی کے بعد نمبر ۲ پر درج ہوتی ہے۔ ہندستانی اخبارات میں ایسے اشتہارات شائع ہونے لگے ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ عربی میں اشتہاری عبارتیں شامل رہتی ہیں۔

یہ محض ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی زبان موجودہ زمانہ میں کتنی اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ نہ صرف اقوام متحدہ اور اس کی دوسری ایجنسیوں کی سرکاری زبان ہے بلکہ جدید دنیا کی تمام بڑی بڑی سرگرمیوں میں اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔

عربی زبان کی اس جدید اہمیت نے ہمارے عربی مدارس کی تعلیم میں ایک نئی اہمیت پیدا کر دی ہے۔ ان مدارس کے طلبہ اگر تکمیل نصاب کے ساتھ عربی لکھنے اور بولنے کی استعداد بھی لے کر نکلیں تو انھیں یہ شکایت نہ ہوگی کہ ــــــ "آج کی دنیا میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔"

یہ امکانات ہمارا انتظار کر رہے ہیں

"ہندستان زیادہ ترقی کرتا اگر اس نے آزادی کے بعد اپنی توجہ اس پر لگادی ہوتی کہ بیل گاڑی کو زیادہ بہتر بنائے" اس قسم کے جملہ پر ایک عام آدمی ہنس دے گا۔ مگر یہ سب سے زیادہ سچی بات ہے جو آزاد ہندستان کے لئے کہی جاسکتی ہے۔ بیل گاڑی محض بیل گاڑی کا نام نہیں، وہ ایک ذہنیت، ایک طرز فکر ہے۔ جس طرح آزادی سے پہلے گاندھی جی کا چرخا محدود معنوں میں محض "چرخا" نہیں تھا، وہ ایک ذہنیت تھا۔ بیل گاڑی پر توجہ دینے کا مطلب مقامی ذرائع پر توجہ دینا تھا۔ اور اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یقیناً آج ہندستان دگنا زیادہ طاقت ور ہوتا۔ جیسا کہ چین کی مثال میں نظر آتا ہے۔

آج بھی ہندستان میں تیرہ ملین بیل گاڑیاں ہیں وہ دس ملین ٹن سامان ڈھوتی ہیں اور اس پر ملک کا تین ہزار کرور روپیہ لگا ہوا ہے۔ اس سے ۲۰ ملین لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔ کافی تاخیر کے بعد اب ملک کے سائنس داں بیل گاڑی کو ترقی یافتہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ بیل کے کندھے کے اوپر سے گاڑی کے بوجھ کو گھٹائیں اور پہیہ کو بریک دینے کا طریقہ دریافت کریں۔ بیل گاڑی کے پہیہ میں بال بیرنگ اور ربڑ ٹائر کا رواج اس سے پہلے ۱۹۵۰ میں شروع ہوا تھا۔

سری لنکا کے ایک صحافی ورینڈر تارزی وٹاشی (VARINDRA TARZIE VITTACHI) ۱۹۴۶ میں مہاتما گاندھی سے دہلی میں ملے تھے۔ "ہم ایشیا کے لوگ بہت جلد آزاد ہونے والے ہیں" انھوں نے گاندھی جی سے کہا "اگر آپ کو کوئی ایک مشورہ دینا ہو تو آپ انھیں کیا مشورہ دینا پسند کریں گے؟" یہ سوال سن کر گاندھی جی کا چہرہ مرجھا گیا۔ انھوں نے غمگین لہجہ میں کہا:

"REDUCE YOUR WANTS AND SUPPLY YOUR NEEDS. OUR NEEDS MAKE US VULNERABLE ENOUGH. WHY INCREASE OUR VULNERABILITY WITH WANTS.
Newsweak, Jan. 26,1976

اپنی مانگ کو کم کرو اور اپنی ضرورت کی چیزیں خود مہیا کرو ہماری ضرورتیں ہم کو کمزور اور جراحت پذیر بناتی ہیں۔ ہم

عام تصور یہ ہے کہ کسی "قدیم" تہذیب کو دوبارہ "جدید" نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح آدمی کو جوانی صرف ایک بار ملتی ہے، اسی طرح تہذیب کو بھی صرف ایک بار عروج نصیب ہوتا ہے۔ اس کے بعد تہذیب پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ اور جو بوڑھا ہو گیا اس کو دوبارہ جوان نہیں کیا جاسکتا۔

مگر چین کی مثال نے اس مفروضہ کی تردید کر دی ہے۔ نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار جیمز رسٹن (JAMES RESTON) نے پیکنگ میں اپنے طویل قیام کے بعد اپنے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ایک رپورٹ تیار کی ہے جس کا عنوان ہے

NEW LOOK OF AN ANCIENT LAND

اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "چین کی قدیم ترین تہذیب کے بارے میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ یہ کہ آج وہ دوبارہ جوان نظر آتی ہے۔ ایک امریکی مشاہد کے نزدیک چین کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا "شباب" ہے۔

کیوں اپنی ضرورتوں کو بڑھاکر دوسروں کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کو بڑھائیں۔

مذکورہ صحافی لکھتے ہیں "جب میں پچھلے ۳۰ سال کے واقعات کو دیکھتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ گاندھی جی کے مشورہ پر صرف چین نے عمل کیا" جب کہ گاندھی جی کا مشورہ چین کو پہنچا بھی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج چین ایشیا کا سب سے طاقت ور اور خودکفیل ملک ہے۔ بقیہ تمام ممالک مغربی قوموں کے اقتصادی غلام ہیں اور ان کے قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

ہندستان نے آزادی کے بعد اندھادھند بدیشی تہذیب کی نقل شروع کردی۔ ملک کے ذرائع کو کام میں لانے کی طرف کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ ڈاکٹر نکولس جیکوے NICOLAS JEQUIER نے ایک کتاب شائع کی ہے:

APPROPRIATE TECHNOLOGY:
PROBLEMS AND PROMISES

وہ لکھتے ہیں کہ زیر ترقی ممالک کی سب سے بڑی دولت ان کی انسانی طاقت ہے۔ مگر کسی ملک میں بھی اس کو بخوبی طور پر استعمال نہیں کیا جارہا ہے۔ جنگل اور زراعت کی ردی چیزیں اور حیوانات کے فضلے بڑی تعداد میں روزانہ ضائع ہورہے ہیں مگر ان کو اب تک کام میں نہیں لایا گیا۔ زراعتی اور غیر زراعتی شعبوں میں بے شمار امکانات غیر استعمال شدہ پڑے ہوئے ہیں۔ مگر ابھی تک ان کی طرف حقیقی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

کھانا تیار کرنے کے لئے آجکل ہندستان میں جو گیس استعمال ہوتی ہے وہ حقیقۃً پٹرولیم کی ضمنی پیداوار (BY-PRODUCT) ہے۔ پہلے یہ گیس یوں ہی ضائع ہوجاتی تھی۔ اب اس کو خاص اہتمام سے سلنڈروں میں بھر لیا جاتا ہے۔ باورچی خانہ کے ایندھن کی حیثیت سے وہ آج ہمارے لئے ایک عظیم نعمت ہے۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کو فضلات (WASTES) کہا جاتا ہے، وہ حقیقۃً کسی چیز کی ضمنی پیداوار ہی ہیں۔ ان کو خاطرخواہ استعمال کیا جائے تو وہ انسان کے لئے بے شمار پہلوؤں سے مفید بن سکتی ہیں۔

مثلاً دھان کی بھوسی کو لیجئے۔ آئی۔ ٹی۔ آئی۔ کانپور اور ریجنل ریسرچ لیبورٹری جورہاٹ میں جو تجربے کئے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوا ہے کہ دھان کی بھوسی سلیکا، سیلولوز، پنٹوز، لگنن جیسے قیمتی اجزاء سے مرکب ہوتی ہے اور اس کو نہایت کامیابی کے ساتھ سمنٹ، فائر پروف بورڈ وغیرہ کے بنانے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بھوسی کی راکھ میں چونا ملاکر باریک پیس دیا جائے تو نہایت عمدہ سمنٹ تیار ہوجاتی ہے۔

ہندستان میں ہر سال ۶۰ ملین ٹن دھان پیدا ہوتا ہے۔ دھان کی بھوسی دھان کا تقریباً ۲۰ فی صد حصہ ہوتی ہے اور بھوسی کی راکھ بھوسی کا تقریباً ۲۰ فی صد حصہ، اس طرح ہندستان میں محض بھوسی کے ذریعہ ہر سال دو ملین ٹن سے زیادہ سمنٹ تیار کی جاسکتی ہے۔ اور اگر پیال کو اس میں شامل کرلیا جائے جو انھیں اجزاء سے مرکب ہوتا ہے جس سے بھوسی بنتی ہے تو اس کی مقدار پندرہ گنا تک بڑھ جاتی ہے۔

یہ ایک ایسا کام ہے جس کی درجنوں شاخیں ہیں۔ مثلاً بلڈنگ کے سامان اور مختلف قسم کے صنعتی کیمیکل تیار کرنا۔ ایسے چھوٹے چھوٹے پلانٹ تیار کرنا جو ملک کی ۲۵ ہزار رائس ملوں میں لگ سکیں اور ہر رائس مل مقررہ کام کے ساتھ ایک "منی سمنٹ پلانٹ" بن جائے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک سو ٹن سالانہ "بھوسی سمنٹ"،

تیار کرنے کا کارخانہ بنایا جائے تو اس کی لاگت تقریباً ۱۵ ہزار آئے گی۔ اور اس کے ذریعہ جو سمنٹ تیار ہوگی وہ عام سمنٹ سے بہت زیادہ سستی ہوگی۔

یہ معاملہ صرف بھوسی اور گٹھلی جیسی چیزوں تک محدود نہیں ہے۔ جانوروں کا گوبر اور انسان کا فضلہ بھی بے شمار فوائد اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ گوبر و فضلہ کو، بغیر کسی خرچ کے، اتنی گیس پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے جس سے گھر کا پورا کھانا پک جائے اور رات کے وقت گھر کی روشنی بھی حاصل ہو سکے۔ ایندھن کے خرچ اور دھوئیں کی کثافت سے بچنے کا یہ نہایت کامیاب ذریعہ ہے۔ اس طریقہ میں مزید فائدہ یہ ہے کہ گوبر یا فضلہ کی اصل کھاد ضائع نہیں ہوتی، بلکہ پوری کی پوری محفوظ رہتی ہے۔ فضلہ کا گیسی حصہ، جو نباتات کے لئے مضر ہے، گھر کے ایندھن اور روشنی میں کام آجاتا ہے اور اس کے بعد عمدہ کھاد خود بخود الگ ہو جاتی ہے۔ کم خرچ، زیادہ فائدہ کا اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ہو سکتا۔

حال میں ایک انجینیرنگ کمپنی نے ایک انجن تیار کیا ہے جو

گوبر گیس سے چلتا ہے۔ اگر آپ کے پاس ۲۰ مویشیوں کا گلہ ہے تو آپ ایک گوبر گیس پلانٹ تیار کر سکتے ہیں۔ اس کی تیاری میں تقریباً چھ ہزار روپے کا خرچ آتا ہے جس کا ایک حصہ سرکار بطور سب سڈی دیتی ہے۔ اپنے گوبر گیس پلانٹ کے ساتھ پانچ ہارس پاور کا انجن لگا کر آپ اپنے کھیتوں اور باغوں کی آب پاشی کر سکتے ہیں جو بجلی یا تیل کے انجن کے مقابلہ میں ۸۰ فی صد تک اخراجات کو کم کر دیتا ہے۔

اس طرح کے بے شمار امکانات ہیں جو اس وسیع ملک میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں، پچھلے ۳۰ برسوں میں جتنا سرمایہ فیملی پلاننگ اور اس سے متعلق پروگراموں میں خرچ کیا گیا ہے، اگر وہ اس طرح کی اسکیموں میں لگایا گیا ہوتا تو ملک کی حالت آج کہیں زیادہ بہتر ہوتی۔

مولانا عبد الماجد دریابادی (۱۹۷۷-۱۸۹۲) مولانا محمد علی (۱۹۳۱-۱۸۷۸) کے بارہ میں فرماتے ہیں:
"میرے دوست مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت بھی میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ بیتاب ہو کر تڑپ کر جوش و خروش سے للکارتے تھے "عبد الماجد اٹھو، چل کر ملحد یورپ میں تبلیغ اسلام کریں" صدق جدید (لکھنؤ) ۲ جون ۱۹۷۷
ڈاکٹر محمد اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۷) نے آخر عمر میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ جس کا نام انھوں نے تجویز کیا تھا:

AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF QURAN

(مطالعہ قرآن کا ایک تعارف)۔ فرماتے تھے "ایک بار کتاب شروع کی تو انشاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کے تمام نظریات توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا" شیرازہ (سری نگر) اقبال نمبر، صفحہ ۶۶
اس طرح کے پرجوش ارادہ کی مثالیں ہمارے یہاں بہت سی ملیں گی۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص نہیں ملتا جس نے مغرب کے انسانوں کے سامنے ان کی زبان میں اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہو۔ اگر کی ہے تو صرف بدنام قادیانیوں نے۔

اسلام: دورِ شمشیر کا خاتمہ، دورِ دعوت کا آغاز

بحرِ مردار (DEAD SEA) اردن اور اسرائیل کے درمیان واقع ہے۔ اس کا دوسرا نام بحر لوط ہے۔ چار ہزار برس پہلے یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ چار بڑے بڑے شان دار شہر اس کے کنارے آباد تھے۔ جب یہاں کے لوگوں میں بگاڑ آ گیا تو لوط بن حاران بن آزر کو خدا نے پیغمبر بنا کر ان کے پاس بھیجا۔ مگر ان کی سرکشی بڑھتی رہی۔ بالآخر جب حجت تمام ہوگئی تو ۲۰۶۱ ق م میں ایک ہولناک زلزلہ آیا۔ ان کی بستیاں الٹ گئیں۔ سمندر کا پانی ان کے اوپر چڑھ گیا۔ پورا علاقہ اس طرح برباد ہو گیا کہ اب وہاں چڑیاں اور مچھلیاں بھی نہیں پائی جاتیں۔

یہی معاملہ تمام نبیوں کے منکرین و مخالفین کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اتمام حجت کے بعد کوئی قوم موجودہ دنیا میں بود و باش کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس لئے فرشتوں یا خود اہل ایمان کے ذریعہ اس دنیا سے اس کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ پیغمبر آخر الزماں کے مخالفین بھی، آپ کا انکار کرنے اور آپ کو آپ کے وطن سے نکال دینے کے بعد، اسی خدائی سزا کے مستحق ہو گئے تھے (اسرار۔ ۷۷) چنانچہ انھیں بھی یہ سزا دی گئی۔ البتہ اس کی صورت بدلی ہوئی تھی۔ دیگر انبیاء کے ساتھیوں کی تعداد چونکہ بہت کم تھی، اس لئے ان کے مخالفین کو ہلاک کرنے کے لئے زلزلہ اور طوفان آئے (عنکبوت۔ ۴۰) مگر نبی آخر الزماں کے ساتھ حمایت کرنے والوں کی بھی معقول تعداد ہو چکی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے خود آپ کے ساتھیوں کی تلوار کو آپ کے مخالفین کی ہلاکت کے لئے استعمال کیا (قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ) بدر کی قتل گاہ، اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ٹھیک ویسی ہی تھی جیسا عاد و ثمود کے برباد شدہ مساکن۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تلوار، پیغمبر اسلام کے مشن کا اضافی جزء تھی نہ کہ حقیقی جزء۔ وہ شکلاً دفاعی جنگ اور حقیقۃً خدائی سزا کے طور پر ظاہر ہوئی، جیسے پچھلی قوموں پر آنے والا عذاب شکلاً زلزلہ یا طوفان تھا اور حقیقۃً ایک منکر قوم پر خدا کی سزا۔ مگر بعد کے دور میں اسلام کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں، عام رواج کے اثر سے "تلوار" کے واقعات بہت زیادہ نمایاں ہو گئے۔ لوگوں کو اسلام کی تاریخ تلوار کی تاریخ نظر آنے لگی۔ حتیٰ کہ خود مسلمان بھی شمشیری کارنامے دکھانے کو سب سے بڑا جہاد سمجھنے لگے۔

بعد کے دور میں اسلام کے ساتھ جو المیے پیش آئے، ان میں یہ المیہ سرفہرست ہے کہ دینِ رحمت دینِ شمشیر بن گیا۔ اسلام جن مقاصد کے لئے آیا، ان میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انسانوں کے درمیان جنگ و جدل کو ختم کر کے سمجھنے اور سمجھانے کے طریقے کو رائج کرے (ص ۔ ۲۹) طاقت کی منطق کی جگہ عقل و فکر کی منطق کو اونچا مقام دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، دورِ تلوار کا خاتمہ اور دورِ دعوت کا آغاز تھا۔ قرآن میں یہ حکم کہ قرآن کے ذریعہ جہادِ کبیر کرو (فرقان) گویا اس بات کا اعلان تھا کہ پیغمبرِ اسلام کی بعثت سے تاریخ انسانی میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جب کہ نظریہ "شمشیر و سناں" کا بدل ہوگا۔ نظریاتی طاقت سے فتوحات حاصل ہوا کریں گی۔

اس اصول کا نہایت کامیاب مظاہرہ خود پیغمبر اسلام نے معاہدۂ حدیبیہ کی صورت میں کیا۔ آپ نے جنگ سے بچنے کے لئے بظاہر ایک مغلوبانہ صلح کر لی۔ آپ میدانِ جنگ کو چھوڑ کر میدانِ دعوت کی طرف واپس چلے گئے۔ یہ صلح جو ظاہر بینوں کے نزدیک "ذلت آمیز شکست" کے ہم معنی تھی، خدا نے اس کو فتح مبین (فتح۔ ۱) قرار دیا۔ ان الفاظ کی صداقت صرف دو برس میں ثابت ہوگئی۔ صلح کے وقت مسلمانوں کی تعداد بمشکل ڈیڑھ ہزار تھی۔ جب کہ اس کے بعد، دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں، ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ اب اسلام اتنا طاقت ور ہو چکا تھا کہ مکہ کسی جنگ کے بغیر فتح ہوگیا۔

مسلمانوں کے اندر بعد کے زمانے میں، یہ جو ذہن پیدا ہوا کہ وہ سیاسی اقتدار سے ٹکرانے اور شمشیری کمال دکھانے کو جہاد سمجھنے لگے، اس کی ایک وجہ اور تھی۔ اور وہ وہی فتنہ تھا جس میں اکثر پچھلی امتیں مبتلا ہوئی ہیں۔

سلیمان بن داؤد (۹۷۳ - ۹۳۷ ق م) یہودیوں کے ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ کی حکومت شام و فلسطین کے علاوہ مشرق میں فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کو بعض غیر معمولی معجزے دیئے گئے تھے۔ ہوا ان کے لئے مسخر تھی، وہ جانوروں کی بولیاں سمجھ سکتے تھے (نمل) معدنیات پر انھیں خصوصی قدرت حاصل تھی۔ جنات ان کے تابع کر دیئے گئے تھے (ص، سبار) اسی قسم کے ایک جن نے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں یمن سے لاکر فلسطین میں رکھ دیا تھا (نمل)

حضرت سلیمان کی وفات کے بعد، آپ کی یہ خصوصیات، یہود کے لئے فتنہ بن گئیں۔ اپنے "قومی بزرگ" کی تقلید میں انھوں نے کوشش شروع کر دی کہ وہ بھی اس قسم کے کمالات اپنے اندر پیدا کریں۔ انھوں نے بطور خود کچھ کرامَاتی فنون ایجاد کئے اور ان کو حضرت سلیمان کی طرف منسوب کر دیا (بقرہ - ۱۰۲) سحر و کہانت اور مختلف قسم کے سفلی عملیات، سب مفروضہ "سلیمانی انگشتری" کے بدل کے طور پر بنے۔ طلسماتی اعمال میں انھوں نے اتنی شہرت حاصل کی کہ ۵۸۶ ق م میں جب ایرانی بادشاہ بخت نصر نے ان کو اپنے وطن سے منتشر کیا تو فلسطین کے باہر بھی توہم پرست لوگوں میں وہ اپنے معتقدین پاتے رہے۔ بابل (قدیم عراق) میں وہ محنت مزدوری کرانے کے لئے لے جائے گئے تھے۔ مگر جیوش انسائیکلوپیڈیا کے مطابق "بابل کا مذہبی احترام ہر خطہ کے یہود میں قائم رہا" (جلد ۲، صفحہ ۳۱۴) ——— سائنٹفک تعلیم کے اثر سے، موجودہ زمانہ میں، یہودیوں میں اس قسم کے عملیات کا رواج ختم ہوگیا۔ تاہم یہ فن اب بھی اپنے سرپرستوں سے محروم نہیں۔ نبی آخر الزماں کی امت نے اس کو "اسلامی" بنا کر زیادہ بہتر طور پر اپنی مقدس سرپرستی میں لے لیا ہے۔

یہی قصہ، مختلف شکلوں میں، دوسرے انبیار کی امتوں کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ ہر نبی کو، اس کے حالات اور زمانہ کے اعتبار سے، کوئی خصوصی چیز دی جاتی ہے۔ اس کی امت کی بعد کی نسلوں میں جب دینی شعور کمزور پڑتا ہے تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے۔ یہ فتنہ ہمیشہ اس خصوصیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو کسی نبی کو دیا گیا تھا۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو خارق عادت معجزے نہیں دیئے گئے۔ اس کے بجائے آپ کے لئے اللہ تعالے نے ایک خصوصی فیصلہ کیا جو، معلوم تاریخ کے مطابق، کسی اور نبی کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرے انبیار کے مخالفین کو

زیر کرنے یا ان کو ہلاک کرنے کے لئے خدائی آفتیں نازل ہوئیں۔ جیسا کہ نوح، لوط اور ہود علیہم السلام کے مخالفین کے ساتھ ہوا۔ مگر پیغمبر اسلام کے لئے اللہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ آپ کے پیروؤں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی جائے اور ان کی تلواروں سے ان کے مخالفین کو زیر کیا جائے (توبہ ـ ۱۴) اور اس طرح ان کو غالب کر کے ایک طاقت ور اسلامی سلطنت قائم کی جائے۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نبی آخرالزماں کے ذریعہ دین خداوندی کو تاریخ کی حیثیت دینی تھی جو ہزاروں نبیوں کی آمد کے باوجود ابھی تک صرف ایک مذہبی افسانہ بنا ہوا تھا۔ نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند کرنے کا لازمی تقاضا تھا کہ کتاب الٰہی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ پیغمبر آخرالزماں کو اگر (اظہارِ دین کی) یہ خصوصیت نہ دی جاتی تو ان فائدوں کا حصول ناممکن تھا۔

پیروانِ اسلام کے پاس فتنہ میں پڑنے کے لئے حضرت سلیمان جیسے معجزات و کرامات نہ تھے۔ آپ کی امتیازی خصوصیت، ظاہری طور پر دیکھنے والوں کے لئے، فتوحات اور سیاسی انقلابات تھے۔ بعد کے زمانہ میں اسلام کے پیروؤں کے لئے یہی چیز فتنہ بن گئی۔ وہ آپ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو آپ کے مشن سے الگ کر کے دیکھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ پیغمبر عربی اقتدارِ وقت سے ٹکرانے اور سیاسی معجزات دکھانے کے لئے آئے تھے۔ اس لئے انھیں بھی تلوار زنی اور سیاست رانی کے جوہر دکھلانے چاہئیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے یہود نے سمجھ لیا کہ حضرت سلیمان کراماتی شعبدوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے آئے تھے، اس لئے انھیں بھی اسی قسم کی چیزوں میں مشغول ہونا چاہئے۔ حالانکہ پیغمبر اسلام کا مشن بھی، قرآن کی تصریحات کے مطابق، وہی تھا جو دوسرے تمام انبیاء کا مشن تھا۔ آپ دعوت الی اللہ اور انذار آخرت کے لئے تشریف لائے تھے۔ نہ کہ تلوار چلانے اور سیاسی کارنامے دکھانے کے لئے۔ جس طرح پچھلے انبیاء زلزلوں اور طوفانوں کے ذریعہ شہروں کو زیر زمین دفن کرنے یا زرخیز زمینوں کو بے آب و گیاہ بنانے نہیں آئے تھے، حالاں کہ یہ سب واقعات ان کے ذریعہ سے وجود میں آئے۔ اسی طرح نبی آخرالزماں تلوار چلانے اور قوموں کو زیر کرنے کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے، اگرچہ مصلحت خداوندی کے تحت یہ واقعات بھی آپ کی زندگی میں پیش آئے۔

اس ذہن کے اثرات بہت عرصہ سے سیرت اور تاریخ کی ترتیب میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ قرآن اور حدیث میں پیغمبر اسلام کی جو تصویر ہے، وہ سیرت میں آکر بدل جاتی ہے۔ سیرت کی کتابیں، دوسرے پیغمبروں کے حالاتِ زندگی کے برعکس، فتوحات اور مغازی کی داستانیں نظر آتی ہیں۔ اسلامی تاریخ تک پہنچ کر یہ ذہن اور ترقی کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ، عملاً، اسلام کی تاریخ سے زیادہ سلاطین اور جنرلوں کے کارناموں کی فہرست بن گئی ہے۔

ایسا ہونا فطری تھا۔ اسلام کی تاریخ، بعد کے زمانہ میں اس وقت مرتب کی گئی جب کہ مسلم تلواروں کی جھنکار سے تمام ممالک گونج رہے تھے۔ فتوحات اور جنگوں کی خبریں سارے مسلم معاشرہ میں سب سے بڑا موضوع گفتگو بنی ہوئی تھیں۔ اس ماحول میں لکھی جانے والی سیرت کی کتابیں اگر "مغازی" کی داستان بن جائیں اور اسلامی تاریخ "فتوح البلدان" کے رنگ میں ڈھل جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ سیرت یا اسلام کی تاریخ اگر کسی دور میں لکھی گئی ہوتی تو اس کا انداز اس سے بالکل مختلف ہوتا جو آج ہمیں اس موضوع کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں پہنچ کر یہ ذہن ایک نئی شدید تر صورت اختیار کر گیا ہے۔ موجودہ زمانہ اسلامی تحریکوں کا زمانہ ہے۔ مگر ہم حیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں جو اسلامی تحریکیں اٹھیں، ان میں سے اکثر اقتدارِ وقت کے خلاف لڑائی بھڑائی کے راستہ پر مڑ گئیں۔ اس کی وجہ، جزوی طور پر وقت کے سیاسی ماحول کے خلاف ردِ عمل اور جزوی طور پر مندرجہ بالا تاریخی نفسیات رہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں، مغربی تہذیب کے تصادم کی وجہ سے، اسلام اور مسلمانوں کے لئے جو مسائل پیدا ہوئے، وہ ایک دعوتی اور تعمیری جدوجہد کا تقاضا کر رہے تھے۔ مگر مسلمان، ساری دنیا میں، شمشیری مقابلہ یا سیاسی ٹکراؤ کے طریقہ کی طرف چلے گئے اور نتیجۃً بربادی کے سوا کچھ بھی ان کے حصہ میں نہ آیا۔

اسلام ساری دنیا کے لئے خدا کی رحمت (انبیاء — ۱۰۷) تھا۔ وہ اس لئے آیا تھا کہ خدا کے بندوں کو خدا کے سایہ کے نیچے جمع کر دے۔ مگر خدا کی یہ رحمت ابھی تک اس کے تمام بندوں تک وسیع نہ کی جا سکی۔ اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خود حاملینِ اسلام پر عائد ہوتی ہے۔

حاملین اسلام، خدا کی رحمت کو تمام انسانوں تک پہنچانے میں ناکام رہے۔ اس کی واحد وجہ وہی ہے جس کو قرآن میں تفرق فی الدین (شوریٰ — ۱۳) کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے آفاقی اور دائمی حصہ کو قرآن میں محفوظ کر دیا تھا اور کہا تھا کہ بس یہی دین کی شاہراہ (صراط مستقیم) ہے، اس پر چلتے رہو۔ اس کے سوا اپنی طرف سے اس میں نئے نئے راستے مت نکالو (انعام — ۱۵۳)۔ مگر مسلمانوں نے خدا کے بتائے ہوئے دین کے سوا بہت سی اور چیزیں نکالیں اور ان کو "دین" قرار دینے پر اصرار کیا۔ ان غیر قرآنی امور پر ساری امت مجتمع نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ لوگوں نے ایک چیز پر اصرار کیا، کچھ لوگوں نے دوسری چیز پر۔ اس طرح دین میں نئے نئے فرقے بنتے چلے گئے۔ ان اختلافات نے لوگوں کو آپس کی لڑائیوں میں مصروف کر دیا، پھر وہ دوسروں تک خدا کا پیغام پہنچانے کا وقت کہاں پا سکتے تھے۔

اسلام ایک سادہ دین ہے (بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ) مگر کچھ لوگوں نے چاہا کہ اسلام کی سادہ تعلیمات میں فنی تفصیلات اور خارجی تعینات کا اضافہ کر کے بزعم خود اس کو "مکمل" کریں۔ یہی کوشش تھی جس نے ان تمام فنون کو پیدا کیا جن کو فقہ اور تصوف اور علم کلام کہا جاتا ہے —— احکام اسلامی کی فنی تفصیلات متعین کرنے کا نام فقہ ہے۔ معرفت الٰہی کے خارجی ذرائع مقرر کرنے کا نام تصوف ہے۔ اعتقاداتِ اسلامی کو عقلی پیمانوں میں ڈھالنے کا نام علمِ کلام ہے۔ بظاہر یہ کوششیں مفید اور بے ضرر معلوم ہوتی ہیں۔ مگر دینِ خداوندی کا معاملہ عام انسانی معاملات سے مختلف ہے۔ دین میں کوئی اضافہ، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بالآخر مقدس بن جاتا ہے۔ جو لوگ ایک بار اس سے وابستہ ہو جائیں، وہ نہ صرف خود بلکہ ان کی نسلیں بھی اس کو چھوڑنے یا اس کو غیر اہم سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ ایسی ہر کوشش دین میں صرف ایک نیا فرقہ وجود میں لانے کا باعث بنتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دین میں کسی طریقہ کا اضافہ کرنا مطلق ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد — جو ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز نکالے جو اس میں نہ ہو

تو وہ قابل رد ہے۔

اس قسم کی کھلی ہوئی ممانعتوں کے باوجود لوگ انتہائی معصومانہ طور پر دین میں اضافے کرتے رہے اور بالآخر ایک دین کو "۷۲" دینوں میں تقسیم کر ڈالا۔

تاہم یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اسلام میں اگر "۷۲" فرقے پیدا ہوئے تو عیسائیت ہیں ۷۲ ۳ فرقے بن گئے۔ ہندوازم اس سے بھی زیادہ فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کے باوجود یہ قومیں باہمی جنگ سے بچ کر تعمیر و استحکام کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ عیسائیت کا یہ حال ہے کہ آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ منظم تبلیغی کام اسی مذہب کے لوگ کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس نے مذہبی تبلیغ کو نئی وسعت اور بلندی عطا کی ہے۔ ہندوازم جدید مغربی دنیا میں زبردست تبلیغی مذہب کی حیثیت سے اپنی جڑیں پھیلا رہا ہے۔ سوامی وویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) سے لے کر سوامی پربھوپادا (۱۹۷۷-۱۸۹۶) تک ہندو مبلغین کا ایک سلسلہ ہے جس نے پوری پوری عمر اسی کام میں صرف کر ڈالی اور وقت کی زندہ زبانوں اور آج کی ترقی یافتہ قوموں میں اپنے دھرم کو بڑے پیمانہ پر پھیلانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر اسلام، عملی طور پر، صدیوں سے ایک جامد مذہب بنا ہوا ہے۔ اس دوران میں اسلام کے پھیلنے کے اگر کچھ واقعات ہیں تو وہ اسلام کی اپنی قوت کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔ اسلام کے نام لیواؤں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب صرف مذہبی فرقہ بندی کی بدعت تک محدود رہے۔ جب کہ اسلام کے نام لیوا اس سے آگے بڑھ کر سیاسی فرقہ بندی کی شدید تر برائی میں گرفتار ہوگئے۔ عام طرز کی فرقہ بندی زیادہ سے زیادہ مذہبی اختلافات پیدا کرتی ہے۔ مگر سیاسی فرقہ بندی وہ بری بلا ہے جو دو فریقوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بناتی ہے۔ وہ مناظرانہ بحثوں کو تلوار اور بندوق کی لڑائی بنا دیتی ہے۔ سیاسی فرقہ بندی میں صرف دو نہتے فریق ایک دوسرے سے نہیں الجھتے بلکہ یہ ایک نہتے گروہ کے ساتھ وقت کے اقتدار کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہترین طاقتیں اور صلاحیتیں سیاست کے مقتل میں ذبح کر دی جاتی ہیں۔ دعوت و تبلیغ کا عمل مسلمانوں کی طاقت کو غیر اقوام کی طرف لگاتا ہے۔ جب کہ "اسلامی سیاست" کا نعرہ مسلمانوں کو خود مسلمانوں کے خلاف دست و گریباں کر دیتا ہے۔ مسلمان دو طبقوں (بے اقتدار اور با اقتدار) میں بٹ کر ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تل جاتے ہیں۔ اس کی نوبت ہی نہیں آتی کہ وہ متحد ہو کر خدا کے دین کی توسیع و اشاعت کا کوئی موثر کام کر سکیں۔

سیاسی فرقہ بندی کا پہلا واقعہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد شیعیت کا ظہور ہے۔ اسلام سے پہلے تمام معلوم زمانوں سے یہ سیاسی رواج چلا آرہا تھا کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہوتا تھا۔ حکومت ساری دنیا میں ایک وراثتی حق سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار اس طریقہ کو ختم کر کے شورائی حکمرانی (شوریٰ-۳۸) کے طریقہ کا اعلان کیا۔ مگر بہت سے لوگ جو اسلام میں داخل ہونے کے باوجود، زمانی افکار سے آزاد نہ ہو سکے تھے، اس تبدیلی کو قبول نہ کر سکے اور پیغمبر اسلام کے بعد آپ کے خاندان میں خلافت کو جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ چونکہ پیغمبر کا کوئی بیٹا نہ تھا، اس لئے

"اہل بیت رسول" کی اصطلاح وضع ہوئی۔ تاکہ بیٹے کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے لئے اس کا استحقاق ثابت کیا جا سکے۔

اس تحریک کو جب کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے دوسری شدید تر غلطی کی۔ جو چیز ابتداءً محض ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی، اس کو انھوں نے ایک باقاعدہ مذہبی عقیدہ بنا ڈالا۔ حتیٰ کہ اس کو نجات کا دار و مدار قرار دے دیا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جس چیز کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت دے دی جائے، چاہے وہ بذات خود کتنی ہی بے اصل کیوں نہ ہو، بالآخر وہ مقدس بن جاتی ہے اور پھر اس کو ختم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی شیعہ عقیدہ کے ساتھ ہوا۔ یہ عقیدہ مقدس بن کر ہزاروں لوگوں کے ذہنوں پر چھا گیا اور اس کے لئے سب کچھ کرنا عین جائز قرار پایا۔

اسلام کی اب تک کی تاریخ میں جتنے بڑے بڑے حادثات گزرے ہیں، ان میں کسی نہ کسی طور پر اس عقیدہ کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اس عقیدہ نے مسلمانوں کو ایک دائمی قسم کی خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ شیعہ گروہ تاریخ کے ہر دور میں مسلم معاشرہ کے اندر منفی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ آغاز اسلام میں خلافت کے جھگڑوں سے لے کر اب تک بمشکل کوئی ایسا مسلم المیہ ملے گا جس میں بالواسطہ یا براہ راست طور پر اس کی کارفرمائی شامل نہ ہو۔

ان باہمی اختلافات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کی وہ طاقت جو اسلام کی اشاعت و توسیع میں لگتی، وہ آپس کی لڑائیوں میں برباد ہو گئی۔ مثال کے طور پر صفین و جمل کی لڑائیوں (۳۷ - ۳۶ھ) اور حسین و یزید کی جنگ (۶۱ھ) میں جو تقریباً ایک لاکھ مسلمان کٹ گئے، وہ اتنے طاقت ور تھے کہ یورپ کی آخری سرحدوں تک اسلام کو پہنچانے کے لئے کافی تھے۔ مگر یہ انتہائی قیمتی گروہ خود اپنے بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہو گیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

قدیم زمانہ میں سیاست کو عقیدہ بنانے کا رواج غیر اہل بیت کے اقتدار کے مقابلہ میں اہل بیت کے اقتدار کو ثابت کرنے کے لئے ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں یہی بدعت نئی شکل میں دہرائی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہمارے قائدین کے سیاسی جوش میں کوئی کمی نہ کر سکا کہ سیاست نے موجودہ زمانہ میں وہ معنویت کھودی ہے جو قدیم زمانہ میں اسے حاصل تھی۔ پچھلی صدیوں میں اجتماعی معاملات کی نوعیت بے حد بدل گئی ہے۔ قدیم زمانے میں سیاسی انقلاب بجائے خود "انقلاب" کے ہم معنی ہوتا تھا۔ آج سیاسی انقلاب صرف ایک ٹربونگ ہے، اگر اس کے ساتھ دوسری غیر سیاسی قوتیں اس کی مدد کے لئے جمع نہ کی گئی ہوں۔

اولاً انیسویں صدی کے آغاز میں اس فکر کا ظہور ہوا جب کہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں سے مغربی استعمار کو ختم کرنے اور مسلم اقتدار کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اس کو بطور شرعی دلیل کے پیش کیا گیا۔ یہ استعمار مسلمانوں کو تعلیم و ترقی اور تبلیغ و دعوت کے میدان میں ہر قسم کے مواقع دے رہا تھا۔ ایک انگریز پروفیسر ٹامسن آرنلڈ (۱۹۳۱) نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے اس زمانہ میں ایک انتہائی قیمتی کتاب لکھی۔ اس کتاب میں یہ عظیم تاریخی رہنمائی تھی کہ سیاسی

اقتدار کے بغیر اسلام اپنی دعوتی قوت سے ملکوں اور قوموں کو فتح کر سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی باتوں سے مسلمانوں کو کوئی دل چسپی نہ ہو سکی۔ کیوں کہ جس سیاسی نظام کا وجود ہی سرے سے حرام ہو اس کے تحت "آدھی پونی مذہبی زندگی" کا سودا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہ رہا کہ ہمارا سیاسی پروگرام دنیوی اعتبار سے نتیجہ خیز ہو۔ اب وہ مقدس جہاد تھا جو افضل العبادات ہے اور جس کی راہ میں اپنے کو مٹا دینا بجائے خود کامیابی ہے۔ کیوں کہ وہ سیدھے جنت تک پہنچاتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک بے شمار لوگ "استعمار" سے لڑ لڑ کر انتہائی بے فائدہ طور پر اپنی جان و مال کو برباد کرتے رہے۔

یہ سیاسی جہاد صرف اجنبی حکمرانوں تک محدود نہ تھا۔ سلطان عبدالحمید ثانی (۱۹۱۸ — ۱۸۴۲) اور شاہ فاروق (۱۹۶۵ — ۱۹۲۰) جیسے مسلم حکمراں بھی اسی سیاہ فہرست میں داخل تھے۔ کیوں کہ وہ مغربی مستعمرین کے "ایجنٹ" بنے ہوئے تھے۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ — ۱۸۳۸) کو ایران، مصر اور ترکی کے حکمراں زبردست مواقع دے رہے تھے کہ وہ دعوتی اور تعلیمی میدان میں اسلام کی تعمیر کا کام کریں۔ مگر ان کی مجاہدانہ سیاست کو اس قسم کے کام حقیر معلوم ہوئے۔ وہ ان مواقع کو چھوڑ کر خود ان حکمرانوں کو تخت سے ہٹانے کے منصوبے بنانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ حکمراں طبقہ سے ان کا ٹکراؤ ہوا۔ وہ ہر ملک سے نکالے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ ترکی کے قید خانہ میں مر گئے —— یہی الم ناک کہانی، موجودہ زمانہ میں، مسلم ملکوں کے بادشاہوں اور مصلحین کے درمیان مسلسل دہرائی جاتی رہی ہے۔

بیسویں صدی میں مسلم ممالک، کم از کم سیاسی معنوں میں، اجنبی اقتدار سے آزاد ہو چکے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی باہمی سیاسی لڑائیاں اب بھی ختم نہیں ہوئیں۔ بلکہ اس نے نظریاتی صورت اختیار کر کے مزید شدت پکڑ لی ہے اب اس کا عنوان ہے: اسلامی قانون کا نفاذ یا حکومت الٰہیہ کا قیام۔ جس ملک میں بھی چیخ پکار کرنے یا احتجاجی سیاست چلانے کے مواقع ہیں، وہاں ہمارے مصلحین اور قائدین اسلامی قانون کا جھنڈا لئے ہوئے اپنی قومی حکومتوں سے ٹکرا رہے ہیں اور پوری قوم کو ایک لامتناہی جنگ میں الجھائے ہوئے ہیں۔ انڈونیشیا کے عبد القہار مذکر (۱۹۰۲ — ۱۹۷۲) کو سابق صدر سوئیکارنو ہر قسم کے اصلاحی کام کے مواقع دے رہے تھے۔ مگر وہ دستور اسلامی کے نفاذ کے نام پر لڑ لڑ کر ختم ہو گئے۔ مصر کے سید قطب (۱۹۰۶ — ۱۹۶۶) کو سابق صدر جمال عبد الناصر نے اسلامی تعلیم و ترقی کے کاموں کے لئے حکومتی تعاون کی پیش کش کی۔ مگر وہ اور ان کی پوری جماعت صدر ناصر کی معزولی سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ان کو پیس ڈالا۔ پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی (— ۱۹۰۳) کو پاکستان کے حکمرانوں نے دعوتی اور تعمیری کاموں کے لئے ہر قسم کا تعاون دینا چاہا۔ مگر ان کے نزدیک سب سے بڑا کام "بے دین حکمرانوں" کو اقتدار سے بے دخل کرنا تھا تاکہ پاکستان میں اسلام کے دیوانی اور فوجداری قانون کو نافذ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے وہ اور ان کی پوری جماعت اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے ٹکراتے رہے۔ ان بے فائدہ قسم کی باہمی لڑائیوں کا یہ فائدہ تو نہیں ہوا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو جاتا۔ البتہ اس اکھیڑ پچھاڑ میں پاکستان کے بہترین امکانات برباد ہو گئے، حتیٰ کہ خود اسلامی تحریک کے سیاسی امکانات بھی۔ کیوں کہ اسلامی حکومت محض مطالبات اور ایجی ٹیشن

سے قائم نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بے حد دوررس منصوبہ بندی درکار ہے اور محاذ آرائی کی فضا میں خاموش منصوبہ بندی کی سیاست سوچی بھی نہیں جاسکتی، اس کو چلانا تو درکنار۔

ہمارے مصلحین کے اس سیاسی ذوق کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اسلام، ہر مسلم ملک میں، برسراقتدار طبقہ کا سیاسی حریف بن کر رہ گیا ہے۔ وہ اسلام کو ٹھیک اسی نظر سے دیکھنے لگے ہیں جیسے امریکہ میں کمیونسٹ پارٹی کو دیکھا جاتا ہے۔ اسلام کے نام پر جب بھی کوئی دعوت اٹھتی ہے، وہ فوراً متوحش ہوجاتے ہیں۔ اسلام کا لفظ، موجودہ حالات میں، ان کے لئے حکمرانوں کو بے اقتدار (UNSEAT) کرنے کی تحریک کے ہم معنی بن گیا ہے۔ غیر اسلامی لوگوں کے ساتھ کام کرنے والوں کو وہ آزادی دینے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ مگر اسلام کے علم برداروں کو کام کے مواقع دینے پر راضی نہیں ہوتے۔ کیونکہ موجودہ فضا میں اس کا مطلب، ان کے نزدیک یہ ہے کہ اپنے قتل کے کاغذات پر خود ہی دستخط ثبت کردیئے جائیں۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کو دوبارہ سربلند کرنے کے سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ اس فضا کو ختم کیا جائے۔ اسلام کو حکمرانوں کا سیاسی حریف بننے سے بچایا جائے تاکہ مسلم ملکوں کے وسائل اسلامی منصوبوں کے لئے حاصل ہوسکیں۔ اور عالمی سطح پر اسلام کی دعوت و اشاعت کی مہم چلائی جاسکے جس کا زمین و آسمان کو سیکڑوں برس سے انتظار ہے۔

انسانی اندازے کتنے غلط ہوتے ہیں

ام عبداللہ بنت ابی حثمہ بیان کرتی ہیں کہ ہجرت حبشہ کے وقت وہ سفر کی تیاری کر رہی تھیں۔ عمر بن خطاب (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) ادھر سے گزرے۔ اس وقت تک وہ مسلمانوں کے اوپر ظلم کرنے میں انتہائی سخت تھے۔ عمر نے کہا: انه للانطلاق یا ام عبد الله (اے ام عبداللہ کیا روانگی ہو رہی ہے)۔ ام عبداللہ نے کہا: خدا کی قسم، ہاں، تم لوگ ہمارے اوپر مصیبت ڈال رہے ہو۔ ہم خدا کی زمین میں نکل جائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے لئے کوئی گنجائش پیدا کردے۔ عمر نے یہ سن کر کہا: خدا تمھارا ساتھ دے (صحبکم الله) یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں رقت طاری ہوگئی۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد ام عبداللہ کے شوہر آئے جو کسی ضرورت سے باہر چلے گئے تھے۔ ام عبداللہ نے ان سے عمر کا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہوجائیں گے۔ ان کے شوہر نے کہا:

لا یسلم ھذا حتی یسلم حمار الخطاب — یہ شخص اسلام قبول کرنے والا نہیں۔ یہاں تک کہ خطاب کا گدھا بھی مسلمان ہوجائے۔

مگر یہی عمر بن الخطاب اس کے تھوڑے دنوں بعد مسلمان ہوگئے اور انھوں نے اسلام کی نئی تاریخ بنائی — انسان اکثر اندازہ کرنے میں غلطی کرتا ہے۔ اگرچہ ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اس کا اندازہ بالکل درست ہے۔

پچھلی شریعتوں میں دین کی حقیقت گم ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے یہاں مقصد پر واقعات کا غلبہ ہو گیا۔ وہ دین کی مقصدی حیثیت کو اس کے واقعاتی پہلوؤں سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ وہ بھول گئے کہ واقعات کی حیثیت، نظریات کے مقابلہ میں، ہمیشہ اضافی ہوتی ہے۔ واقعات سے بظاہر دین کی جو تصویر بن رہی تھی اسی کو انھوں نے اصل دین سمجھ لیا۔ اور پھر دین کی ایسی تشریح کر ڈالی جس کا اصل آسمانی دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس بگاڑ کی ایک جزدی مثال وہ ہے جو قرآن میں سورہ آل عمران (۹۳) اور سورہ انعام (۱۴۶) میں بیان کی گئی ہے۔ یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (۱۸۵۳ — ۲۰۰۰ ق م) جن کا دوسرا معروف نام اسرائیل ہے، یہود کے پیغمبر تھے۔ آپ نے طبی ضرورت کے تحت بعض جائز غذائیں چھوڑ دی تھیں۔ اسرائیلی روایات کے مطابق آپ کو عرق النسار کی شکایت تھی۔ اس لئے بطور علاج آپ نے بعض چیزوں مثلاً اونٹ کا دودھ اور گوشت سے پرہیز شروع کر دیا تھا۔ آپ کے بعد آپ کی اولاد نے بھی اپنے بزرگ کی تقلید میں ان کو چھوڑے رکھا۔ حتیٰ کہ آخر میں یہ ذہن بن گیا کہ یہ چیزیں بجائے خود حرام ہیں اور بالآخر یہودی فقیہوں نے اپنی مقدس کتاب (تورات) میں ان کی حرمت درج کر دی:

"چوپایوں میں سے جو جگالی کرتے ہیں یا ان کے پاؤں چرے ہوئے ہیں، تم ان کو یعنی اونٹ اور خرگوش اور سافان کو نہ کھانا۔ کیونکہ یہ جگالی کرتے ہیں لیکن ان کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں۔ سو یہ تمھارے لئے ناپاک ہیں" استثنا ۱۴: ۷ (احبار ۱۱: ۴-۶)

یہود کے ایک بزرگ پیغمبر کا بعض غذاؤں کو نہ کھانا، آپ کی زندگی کا محض ایک اتفاقی جزء تھا، اس کا آپ کے پیغمبرانہ مشن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر یہود اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ جو چیز محض ایک اتفاقی واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی، اس سے وہ حرام و حلال کے قوانین اخذ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے دین خداوندی کی ایسی تصویر بنا ڈالی جو بظاہر درست ہونے کے باوجود سراسر غلط تھی۔

بگاڑ کی اس قسم کی کلی مثال بھی یہود ہی کے یہاں ملتی ہے اور وہ ان کی آخرت فراموشی اور دنیا پرستی ہے۔ یہود، پیغمبر آخرالزماں کی بعثت سے قبل، دین خداوندی کے نمائندے تھے۔ اپنی اس تاریخ کے تقریباً دو ہزار سال کے دوران انھوں نے عروج و زوال کے زبردست واقعات دیکھے۔ ایک طرف داؤدؑ (۹۷۰ — ۱۰۴۴ ق م) اور سلیمانؑ (۹۳۲ — ۹۹۰ ق م) جیسے بڑے بڑے بادشاہ ان کی قوم میں اٹھے۔ اور یوسفؑ (۱۸۱۶ — ۱۹۰۶ ق م) جیسی عظیم شخصیت ان میں پیدا ہوئی جس کو اس وقت کے شاہ مصر نے ملک کا پورا انتظام سونپ دیا اور اس کے بعد یہود کو موقع ملا کہ مصر کے انتہائی زرخیز علاقہ میں اپنی آبادیاں قائم کر سکیں۔ فرعون کی غرقابی کے بعد وہ شام و فلسطین کے سرسبز اور زرخیز علاقہ کے وارث بنا دیئے گئے (اعراف — ۱۳۷)

دوسری طرف یہود کی تاریخ میں بار بار وہ ہولناک لمحے بھی آئے ہیں جب کہ انھوں نے اپنی بدی سے "خداوند کو غصہ دلایا۔ اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے ان کو غارت گردوں کے ہاتھ میں کر دیا جو ان کو لوٹنے لگے، اور اس نے ان کو ان کے دشمنوں کے ہاتھ جو آس پاس تھے بیچا۔ سو وہ پھر اپنے دشمنوں کے سامنے کھڑے نہ ہو سکے۔ اور

وہ جہاں کہیں جاتے، خداوند کا ہاتھ ان کی اذیت ہی پر تلا رہتا تھا۔ سو وہ نہایت تنگ آگئے۔ (قضاۃ ۲: ۱۱-۱۷)
مصر سے نکلنے کے بعد ۱۴۴۰ اور ۱۴۰۰ ق م کے درمیان تقریباً چالیس سال تک ان کا یہ حال رہا کہ اپنے "گناہ اور عہد شکنی"
کے جرم میں وہ صحرائے سینا (دشت فاران سے شرق اردن تک) بھٹکتے رہے۔ کیوں کہ ان کے بارے میں خداوند نے
کہہ دیا تھا کہ "میں اس سارے خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر جٹ ہے، ایسا ہی کروں گا۔ اس دشت میں وہ برباد
ہو جائیں گے اور یہیں ہلاک ہوں گے (گنتی ۱۴: ۳۴-۳۵)۔ ۷۲۱ ق م میں اشور کے سخت گیر فرماں روا سارگون
نے سامریہ کو فتح کر کے مملکت اسرائیل کا خاتمہ کیا اور ہزاروں یہودی مار ڈالے۔ ۲۷ ہزار سے زیادہ یہودیوں کو ان کے
ملک سے نکال کر تتر بتر کر دیا۔ وہ دوبارہ آباد ہوئے تو ۵۹۸ ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے
یہودیہ کے بادشاہ کو اپنا قیدی بنا لیا۔ دوسری بار ۵۸۷ ق م میں بخت نصر نے شدید تر حملہ کیا اور یہودیہ کے تمام
چھوٹے بڑے شہروں کو ویران کر ڈالا۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔ بعد کو ان کے حالات
بدلے اور انھوں نے دوبارہ اپنے ہیکل کی اور اپنے شہروں کی تعمیر کی۔ مگر ۷۰ء ق م میں پھر ٹیٹس رومی نے تلوار
کے زور پر یروشلم کو فتح کر لیا اور بائبل کے بیان کے مطابق ان کے ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مار ڈالے۔ ۲۷ ہزار آدمیوں
کو پکڑ کر لے گیا تا کہ ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوائے اور شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لئے استعمال کرے۔
یروشلم اور مقدس ہیکل کو بھی اس نے دوبارہ ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔

یہود کی دو ہزار سالہ قدیم تاریخ میں اس قسم کے اتار چڑھاؤ کے واقعات بار بار پیش آئے۔ کبھی انھوں نے
دنیوی عیش و اقتدار کا لطف اٹھایا، کبھی دنیوی ذلت اور بربادی کا دکھ جھیلا —— ان کے انبیاء بار بار ان واقعات
کو یاد دلا کر انھیں نصیحت کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے ان کا ذہن یہ بن گیا کہ خدا کا انعام اور سزا
دونوں اسی دنیا میں ملتے ہیں —— انھوں نے جنت اور جہنم کی دنیوی تعبیر کر ڈالی —— اس کے بعد اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ کتاب
مقدس کی ترتیب میں ان کے یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب آسمانی کتاب کے نام سے جو کتاب
(تورات) ان کے یہاں پائی جاتی ہے —— اس میں دنیوی جنت اور دنیوی جہنم کی تفصیلات سے تو باب کے باب بھرے
ہوئے ہیں مگر آخرت کی جنت اور جہنم کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو محض اشاراتی شکل میں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کا ذہن انتہائی دنیا پرستانہ ہو گیا۔ جب انھوں نے دنیا ہی کو انعامات خداوندی کا
مقام سمجھ لیا تو بالکل فطری تھا کہ وہ دنیا کی زندگی کے انتہائی حد تک عاشق ہو جائیں۔ قرآن کے الفاظ میں ان کا یہ
حال ہوا: "تم ان یہودیوں کو سب سے زیادہ حیاتِ دنیا کا حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر۔ ان
میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار ہزار برس تک جیتا رہے (بقرہ —— ۹۶) مال کی محبت میں ان کی اکثریت کا یہ حال
ہوا: "اگر تم ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھ دو تو وہ اس کو واپس نہ کریں گے۔ الا یہ کہ تم ان کے سر پر سوار
ہو جاؤ (آل عمران —— ۷۵) —— اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی دنیا پرستی خالص "نظریاتی" نوعیت کی حامل تھی۔
دنیا کی تمام برائیاں دراصل نفس پرستی کی برائیاں ہیں نہ کہ حقیقۃً نظریاتی برائیاں۔ مگر نفس پرستی کی ہر قسم ابتداءً سادہ

اور معصوم نظریات کی زمین پر اگتی ہے۔ نظریاتی بنیاد کا سہارا لئے بغیر کوئی برائی اس زمین پر جڑ نہیں پکڑ سکتی۔
قرآن نے پہلی بار انسانیت کو اس گمراہی سے نکالا۔ اس نے نظریہ اور تاریخ کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔ اور اصل دین کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا کہ کسی بندۂ خدا کو حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔
قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ

(شوریٰ - ۱۳)

راہ ڈال دی تم کو دین میں وہی جو کہہ دی تھی نوح کو اور جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر)

اس آیت کے سلسلے میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس میں الدین سے مراد دین کی اصولی اور اساسی تعلیمات ہیں۔ تفصیلی شریعت یہاں مراد نہیں ہے۔ اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں یہ حکم ہے کہ اس متفق علیہ دین پر قائم ہو جاؤ جو تمام انبیاء کو دیا گیا تھا۔ اب چونکہ، قرآن کی تصریح کے مطابق، مختلف انبیاء کی شریعت اور منہاج میں اختلاف تھا (مائدہ - ۴۸) اس لئے شریعتوں پر اتفاق کے ساتھ عمل نہیں ہو سکتا۔ صرف اساسات دین کے سلسلہ میں یہ ممکن ہے کہ متفقہ طور پر ان کے اوپر عمل کیا جا سکے۔ کیونکہ اساسی تعلیمات سب کے یہاں ایک تھیں۔

اس حکم کے ذریعہ انبیاء کی دعوت اور انبیاء کی تاریخ کے درمیان نوعی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ مشن خواہ ایک ہو، مگر تاریخیں ہمیشہ جدا جدا بنتی ہیں۔ مختلف انبیاء کے گرد جو الگ الگ تاریخی نظائر بنے یا وقتی حالات کے اثر سے ان کی زندگی میں جو اتفاقی اجزاء شامل ہوئے، ان کو قرآن نے ان کے اصل مشن سے الگ کر دیا اور غیر متبدل اور ابدی تعلیمات کو "الدین" قرار دے کر حکم دیا کہ اصل اور مستقل اہمیت اس کو دو اور اس کی تعمیل میں پوری طرح لگ جاؤ۔

ہر نبی اپنے حالات کی رعایت سے کوئی مخصوص طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ اس کا یہ عمل ایک وقتی نظیر تو ضرور ہوتا ہے۔ مگر وہ دائمی حجت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر حضرت سلیمان نے یمن کی مشرک ملکہ کو جنگ کی دھمکی دی۔ حضرت یوسف نے مصر کے مشرک بادشاہ کے ساتھ تعاون کا طریقہ اختیار کیا۔ حضرت مسیح نے فلسطین کے مشرک حکمرانوں سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔ یہی عملی فرق انفرادی امور میں بھی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ نے مدین کے ایک صالح خاندان میں شادی کی تو آپ کا مہر آٹھ سالہ خدمت قرار پائی۔ حضرت علی کا نکاح پیغمبر کی لڑکی سے مدینہ میں ہوا تو آپ نے مہر میں ایک زرہ ادا کی۔ وغیرہ۔ اصولی تعلیمات اور عملی تفصیلات میں اس قسم کا فرق لازمی ہے۔ اور اکثر بگاڑ اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ کسی عملی نظیر کو وہی اہمیت دے دی جاتی ہے جو کہ ایک اصولی حکم کو دینا چاہئے۔

اساسات دین اور متعلقات دین کا یہ فرق ذہن میں ہو تو یہی خدا پرستی پیدا ہوتی ہے۔ فرقہ بندی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ دینی کوششیں اپنے صحیح مقام پر لگنے لگتی ہیں۔ آدمی اس فتنہ سے بچ جاتا ہے کہ دین کے نام پر ایک ایسی چیز کے لئے معرکہ آرائی شروع کر دے جو حقیقۃً اس کے لئے دینی فریضہ کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔

اس فرق کی ایک حکمت یہ ہے کہ اصل دین اور بقیہ تفصیلات کی حیثیت کسی مجموعی فہرست کی نہیں ہے۔ بلکہ عملی تفصیلات، اصل دین کے لئے لوازم ونتائج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل دین اگر بیج ہے تو عملی تفصیلات اس کی شاخیں ہیں۔ اصل دین جب قائم ہوجاتا ہے تو بقیہ تفصیلات بھی، حسب حالات، وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ اصل دین مطلق طور پر ہمیشہ مطلوب ہوتا ہے۔ جب کہ عملی تفصیلات ان واقعی حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتی ہیں جن میں کوئی شخص اپنے آپ کو پارہا ہو۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اصل دین کے علاوہ دین کے جو اور تقاضے ہیں، ان پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ حکم صرف مسئلہ کی نوعیت کو بتارہا ہے نہ یہ کہ ایک ضروری ہے اور دوسرا غیر ضروری۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصولاً اور اولاً جو چیز بندوں سے مطلوب ہے، وہ صرف وہی "الدین" ہے جو تمام انبیاء کے یہاں مشترک ہے، خواہ وہ جس حال میں اور جس مقام پر بھی پائے گئے ہوں۔ اس کے بعد جو دوسرے متعلقات اور تقاضے ہیں، وہ حالات کی نسبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں لازماً فرق بھی ہوگا، اور کمی بیشی بھی۔ اس لئے اس قسم کے فروق پر مت لڑو۔ اپنے حالات کے مطابق اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے اپنی تمام توجہ اصل دین پر مرتکز رکھو۔

"اے نابینا صاحب، سنبھل کر قدم بڑھائیے۔ آپ جس راستہ پر چل رہے ہیں، اس میں آپ کے آگے ایک کنواں ہے۔" یہ فقرہ گرامر کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ اخلاق اور تہذیب کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔ مگر یہ بظاہر صحیح فقرہ اس وقت بالکل بے معنی ہوگا جب کہ نابینا شخص کنوئیں کے عین کنارے پہنچ گیا ہو اور اندیشہ ہو کہ اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو وہ کنوئیں کے اندر جا گرے گا۔ ایسے نازک موقع پر دوسری تمام باتیں حذف ہوجاتی ہیں اور کہنے والا چلا اٹھتا ہے: "کنواں، کنواں"

ایسا ہی کچھ معاملہ خدائی پیغام رسانی کا ہے۔ بظاہر زندگی کے بے شمار مسائل ہیں۔ مگر ہر آدمی سب سے پہلے جس مسئلہ سے دوچار ہے، وہ موت ہے۔ موت کسی شخص کی زندگی کا وہ فیصلہ کن لمحہ ہے جب کہ اس سے عمل کی مہلت چھین لی جاتی ہے اور وہ اچانک ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں دو ہی چیزیں ہیں۔ یا جنت یا جہنم۔

موت کے معاملہ کی نزاکت اس وقت بے حد بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کے لئے آسکتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک بتانے والے کے پاس سب سے پہلی اور سب سے بڑی بات جو لوگوں کو بتانے کے لئے ہونی چاہئے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو موت کے خطرہ سے آگاہ کرے۔

نجات کا راستہ

ایک شخص ہمہ تن اپنے ذاتی کاروبار میں لگا ہوا ہو تو اس کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے صرف رسمی آداب رہ جاتے ہیں۔ یہی معاملہ خدا سے تعلق کا بھی ہے۔ دنیوی ترقی حاصل کرنا، اپنے بچوں کی خواہشات پوری کرنا، دنیا میں اپنے کو عزت اور سربلندی کے مقام پر دیکھنا، انسان کو اتنا زیادہ مرغوب ہیں کہ اس کا سارا وقت اور توجہ انھیں چیزوں میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد رب العالمین کے لئے اس کے پاس جو چیز بچتی ہے، وہ صرف رسمیات ہیں۔ وہ بطور خود کچھ رسمی اعمال وضع کرلیتا ہے۔ یا خدا کی بتائی ہوئی عبادات کو بے روح کر کے ان کو ایک قسم کے رسمی ضمیمہ کے طور پر اپنی زندگی میں شامل کرلیتا ہے۔ اور پھر وقتی طور پر ان رسوم کی تکمیل کر کے اپنے دل کو مطمئن کرلیتا ہے کہ وہ خدا کا حق بھی ادا کر رہا ہے۔

قرآن اس لئے اتارا گیا کہ خدا پرستی کے طریقوں میں لوگوں نے جو فرق ڈال رکھا ہے، اس کو واضح کرے اور صحیح طریقہ کی نشان دہی کر دے (نحل - ۶۴) قرآن جس زمانہ میں آیا، ساری دنیا میں کوئی نہ کوئی مذہب رائج تھا۔ کوئی قوم ایسی نہ تھی جو مذہب کی قائل نہ ہو۔ مگر ہر ایک نے خود ساختہ طور پر کچھ چیزوں کو مذہب اور خدا پرستی کا درجہ دے رکھا تھا —— مذہب کو انھوں نے ایسی شکل دیدی تھی جو ان کی دنیا پرستانہ مصروفیات کے ساتھ جمع ہو سکے۔ جو ان کی زندگی کے بنے بنائے ڈھانچہ کو کھنڈت کرنے والا نہ ہو۔

لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی ساری توجہ اپنے دنیوی کاروبار میں لگائے رہتے اور اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے ایک مقدس جگہ پر جمع ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجا لیتے۔ ان کا خیال تھا کہ بس اتنی بات خدا کو راضی کرنے کے لئے کافی ہے (انفال - ۳۵)۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ عبادت خانوں کی عمارتیں بنا کر اور لوگوں کو "دیگیں" کھلا کر اپنے خدا کو خوش کرلیں گے (توبہ - ۱۹) کچھ لوگ خدا پرستی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ انسانی ہنگاموں سے الگ ہو کر اپنے لئے تنہائی کا ایک گوشہ بنا لیا جائے اور وہاں بیٹھ کر خدا کے نام کی جپ کرلی جائے (حدید - ۲۷) کچھ اور لوگ تھے جو خدا پرستی کا کمال یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جن افکار و خیالات کا رواج ہو جائے، انھیں کے رنگ میں رنگ کر مذہب کو بھی پیش کر دیا جائے (توبہ - ۳۰) حتیٰ کہ عرب میں ملت ابراہیمی کی باقیات کے طور پر روزہ، نماز، حج اور قربانی وغیرہ بھی کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی تھیں۔ مگر یہ تمام چیزیں بالکل بے روح شکل میں تھیں۔ وہ ایسی ہی تھیں جیسے کسی کے پورے ہاتھ میں ایک چھنگلیا لٹک رہی ہو، جس کا آدمی کی اصل ہستی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

قرآن نے اعلان کیا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز وہ نہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہو اور جس کے کرنے والے کو وہ آخرت کے انعامات سے نوازے (بقرہ - ۱۷۷) اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ کہ اس کے بندے اپنے خالق کو "کبیر" مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو "صغیر" بنا لیں۔ یہ اصلاً ایک قلبی کیفیت ہے۔ انسان، اپنی حقیقت کے

اعتبار سے ایک نفسیاتی وجود ہے، اس لئے اس سے جو آخری عمل مطلوب ہو سکتا ہے، وہ بھی نفسیاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر اپنے بندوں کے دل کو دیکھتا ہے۔ دل کا جھکاؤ۔ دل کا خوف۔ دل کی فروتنی ہی وہ چیز ہے جو کوئی بندہ اپنے رب کو پیش کرتا ہے ——— "اللہ کو تمھاری قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کو تمہارا تقوی پہنچتا ہے (حج۔ ۳۷)

تاہم انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ اس کے دل میں جو کیفیت ہو۔ وہ ضرور اس کے جسم اور اس کی خارجی سرگرمیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک شخص کو اپنے بیٹے سے پیار ہو تو اس کے عمل سے بھی اس پیار کا اظہار ہوگا۔ کوئی شخص سانپ سے ڈر رہا ہو تو اس کی حرکات بھی ضرور اس کی اس کیفیت کی گواہی دیں گی۔ اسی طرح خدا کے آگے اپنے آپ کو صغیر (چھوٹا) بنانا اگرچہ باعتبار حقیقت ایک قلبی حالت ہے۔ لیکن جب وہ کسی دل کے اندر واقعی معنوں میں پیدا ہو جائے تو اس کے اعضاء و جوارح اور اس کے حرکات و اعمال سے بھی لازماً اس کا اظہار ہوگا۔ نتیجۃً پوری زندگی اس ا… کے دائرہ میں آتی چلی جائے گی۔

حقیقی خدا پرستی، جو آدمی کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہوگی، یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو پورے معنوں میں خالق، مالک، رب اور محاسب و مجازی تسلیم کرے۔ اس کے ساتھ کسی معاملہ میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ پھر دل و دماغ میں اس کی بڑائی کے احساس کو جگہ دے۔ اس کا اندرونی وجود، اس کی احسان مندی کے جذبہ سے سرشار ہو اور اسی کی طاقت و قوت کے خوف سے کانپتا رہے۔ پھر اس کا ہاتھ، اس کا پاؤں، اس کی آنکھ، اس کی زبان اور اس کے تمام اعضاء و جوارح اسی دائرہ کے اندر اپنے وظائف ادا کریں جو خدا نے اپنی شریعت میں ان کے لئے مقرر کیا ہے۔ اس کی پوری ہستی اس دعا کی عملی تفسیر بن جائے جو رکوع اور سجدہ میں پڑھنے کے لئے ہمیں تلقین کی گئی ہے:

اللّٰھُمَّ خشع لك سمعی وبصری ومخی وعظمی وعصبی

خدایا تیرے لئے جھک گیا میرا کان، میری آنکھ، میرا مغز، میری ہڈی اور میرے اعصاب

اسی طرح انسانوں سے تعلقات اور دنیا کے مختلف معاملات میں وہ اسی رویہ کو اپنائے جو خدا نے بتایا ہے۔ اور اس رویہ سے پوری طرح بچتا رہے جس سے خدا نے منع کیا ہے ——— دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو دنیا کے پیچھے اپنی پوری زندگی لگا دے۔ اسی طرح آخرت کی نجات کا حق دار بھی وہی ہوگا جس نے اپنی زندگی کو اس کی راہ میں پوری طرح کھپا دیا ہو۔

پچھلے مذاہب میں بگاڑ کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر غلطی کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔ یہاں ایک غلطی کرنے کے بعد اس کے انجام سے بچنا ممکن نہیں۔ کوئی شخص غصہ میں آکر اپنے بیٹے کا ہاتھ کاٹ ڈالے تو وہ ہمیشہ کے لئے بے ہاتھ ہو جائے گا۔ اس کے بعد کا کوئی بھی عمل اس کے بیٹے کو دوبارہ ہاتھ والا نہیں بنا سکتا۔ اس پر قیاس کر کے سمجھ لیا گیا کہ اعمال کے اخروی نتائج بھی لازمی ہیں۔ ان سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

اس ذہن نے مذاہب میں دو بڑے مدارس فکر پیدا کئے۔ ایک وہ جس کو تناسخ ارواح کہا جاتا ہے۔ اس فکر کے ماننے والوں نے یہ گمان کر لیا کہ آدمی بار بار جنم لے کر اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتتا رہتا ہے۔ انسان کی حالت میں اگر وہ غلطی کرے تو

دوسرے جنم میں وہ کسی نچلی مخلوق کی شکل میں اٹھتا ہے۔ اس طرح بے شمار جنموں میں اپنے اعمال کی پاداش بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں پہنچتا ہے۔

دوسرا ذہن جو اتنی لمبی سزا کو بھگتنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا۔ اس عقیدہ کے مطابق، انسان کے گناہوں کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ گناہ ایک ایسا عمل ہے جو ایک مرتبہ سرزد ہو جائے تو اس کے نتائج سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ انسان کو اس لازمی عذاب سے بچانے کے لئے خدا نے یہ کیا کہ اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا۔ خدا کے بیٹے نے انسان کی صورت میں مجسم ہو کر تمام نوع انسانی کے گناہوں کو اپنے سر پر لے لیا اور اس کی تلافی کے لئے خود سولی پر چڑھ گیا۔ اس طرح گویا خدا خود قربان ہو کر نسل انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔

قرآن نے انسان کو اس عظیم الشان گمراہی سے نکالا اور صاف لفظوں میں اعلان کیا: "کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے (زمر-۵۳) اسلام نے بتایا کہ انسان اور اس کے عمل کے درمیان ایک اور ہستی ہے۔ یہ خدا ہے جو ساری قوتوں کا مالک ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ جو چیز چاہے باقی رکھے، جو چیز چاہے مٹا دے۔ آدمی گناہ کرنے کے بعد اگر پلٹ آئے۔ وہ اپنی روش کی اصلاح کر کے خدا سے معافی مانگے تو وہ دوبارہ پاک صاف ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ ایسا ہو جاتا ہے گویا آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آیا ہے (کیوم ولدتہ امہ)

اسلام کے ذریعہ اللہ نے اپنی جن رحمتوں کا اعلان کیا ہے، وہ یہیں تک محدود نہیں۔ ان کا سلسلہ اس سے بہت آگے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی رحمتیں اتنی وسیع ہیں کہ وہ کبھی خود تمہارے گناہوں کو نیکیوں کے خانہ میں لکھ دیتا ہے۔ اس کی قدرت کاملہ تمہاری غلطیوں کے اندر سے تمہارے لئے نئی کامرانی کے مواقع کھول دیتی ہے۔ یہ نہ صرف رحمت خداوندی کا انتہائی اعلیٰ تصور ہے۔ بلکہ یہ اصول خود انسانی نفسیات کو سمجھنے کا نیا دروازہ کھولتا ہے۔ اور انسان کو ان بے پایاں امکانات سے باخبر کرتا ہے جو اس کے خدا نے اس کے لئے اس کائنات میں رکھ دیئے ہیں۔

زید بن ثابت انصاری عربی زبان کے علاوہ فارسی، رومی، قبطی، حبشی اور سریانی زبانیں جانتے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دیگر زبانوں میں جو خطوط آتے تھے، ان کا جواب لکھتے تھے۔

وہب بن منبہ عربی کے علاوہ یونانی زبان جانتے تھے۔ انھوں نے یمن میں رہ کر یہودیوں اور عیسائیوں کی تاریخ معلوم کی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں انبیاء کے قصے لکھے۔

موسیٰ بن سیار اسواری کے متعلق جاحظ نے لکھا ہے کہ ان کو عربی اور فارسی دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کی مجلس میں دائیں جانب عرب ہوتے تھے اور بائیں جانب ایرانی۔ وہ قرآن کی ایک آیت پڑھ کر عربوں کے لئے اس کی شرح عربی میں بیان کرتے، اور پھر بائیں جانب منھ پھیر کر ایرانیوں کے لئے فارسی میں تفسیر کرتے۔ اور یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس زبان میں زیادہ خوبی کے ساتھ بول رہے ہیں۔

ماہنامہ 'الرسالہ' کی دسمبر ۸۸ء کی اشاعت میں صفحہ ۳۸ پر مضمون "یہ تمثیل ہے نہ کہ واقعہ" نظر سے گزرا۔ اس مضمون سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حدیث "فَاِنَّ مَرْأَةً خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ"، یا حدیث "فَاِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ" میں ابہام پایا جاتا ہے۔ اور ان سے اصل مدعا واضح نہیں ہو پاتا یہ حدیثیں اپنی پوری شکل میں نقل نہ ہو کر مختصر منقول ہیں۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ جس حدیث کو مضمون میں مختصر کہا گیا ہے وہ مختصر نہیں مفصل ہے:

"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِي جَارَهُ، وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ، وَاِنَّ اَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ اَعْلَاهُ، فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَاِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا"

"جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتا ہو، اسے اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچانی چاہئے۔ اور عورتوں کے حق میں بھلائی کرنے سے میری وصیت قبول کرو، کیوں کہ وہ پسلی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ جو پسلی سب سے بڑی ہے وہ سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے میں لگو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ اور اگر یوں ہی رہنے دیتے ہو تو وہ ٹیڑھی رہے گی۔ پس عورتوں کے حق میں بھلائی کرنے کی میری وصیت قبول کرو" (اخرجه البخاری)

دوسری روایت جس کو مضمون میں غیر مختصر قرار دیا گیا ہے، وہ یہ ہے:

"اَلْمَرْأَةُ كَالضِّلَعِ اِنْ اَقَمْتَهَا كَسَرْتَهَا، وَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَفِيهَا عِوَجٌ" بخاری

"عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم اسے سیدھی کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دو گے۔ اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو ٹیڑھے پن کے ہوتے ہوئے فائدہ اٹھا سکتے ہو"

یہ حدیث پہلی حدیث کے مقابلہ میں مفصل نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں "مِنْ ضِلَعٍ" (پسلی کی) کے بجائے "كَالضِّلَعِ" (پسلی کی طرح) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک حدیث کو سمجھنے میں دوسری احادیث سے مدد ملتی یا مل سکتی ہے لیکن اس سے کسی حدیث کا مبہم یا غیر واضح ہونا ضروری نہیں ہے۔ خود قرآن کی بعض آیتوں کے سمجھنے میں دوسری آیتوں سے مدد ملتی ہے۔ حالاں کہ قرآن کی تمام آیات اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ انھیں ناقص نہیں کہہ سکتے۔

اگر ایک مضمون کی مختلف روایات میں الفاظ کا اختلاف

حدیث میں ہے: المرأة کالضلع (عورت پسلی کی مانند ہے) دوسری روایت کے الفاظ ہیں: انهن خلقن من ضلع (عورتیں پسلی کی بنی ہوئی ہیں)۔ دونوں روایتوں کا مفہوم ایک ہے۔ "پسلی" کا لفظ یہاں نسوانی فطرت کی تمثیل کے لئے ہے۔ یعنی عورت کے مزاج میں، بعض مصالح کی بنا پر، ایک قسم کا ٹیڑھ یا ضد رکھی گئی ہے۔ اس ٹیڑھ کو سمجھ کر اس سے نباہ کرو۔ اس کو سیدھا کرنا ایسا ہی ہے جیسے پسلی کے خم کو سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دوسری روایت میں "من" کا لفظ اسی مفہوم میں ہے جس میں قرآن کی آیت خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ میں "مِنْ" کا لفظ —— الرسالہ

پایا جاتا ہے تو اس میں اس کا بھی امکان ہے کہ یہ مختلف الفاظ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں۔ کسی واقعہ کا ذکر آپؐ نے مختلف مواقع پر فرمایا ہو اور اس کے لئے الفاظ آپؐ نے مختلف استعمال کئے ہوں۔ خود قرآن میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک ہی شخص کا قول قرآن مختلف مقامات پر مختلف الفاظ میں نقل کرتا ہے لیکن اصل مفہوم اور معنی کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ عین ممکن ہے کہ "مِنْ ضِلَعٍ" اور "کَالضِّلَعِ" دونوں الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے ہوں کسی موقع پر آپؐ نے "مِنْ ضِلَعٍ" فرمایا ہو اور کسی دوسرے موقع پر "کَالضِّلَعِ" فرمایا ہو۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے

اور اگر دونوں میں سے ایک روایت راوی کے اپنے الفاظ میں منتقل ہوئی ہو، اس کے الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوں، جب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ راوی کو قولِ رسولؐ کے سمجھنے میں کوئی دھوکا ہوا ہے یا روایت کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ "مِنْ ضِلَعٍ" اور "کَالضِّلَعِ" میں جیسا کہ عرض کیا گیا مفہوم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ "خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ" بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں ہے:

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ — "بنا ہے انسان شتابی کا"

یعنی انسان جلد باز مخلوق ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے

وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا — "اور انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔"
(بنی اسرائیل: ۱۱)

قرآن سے ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ○

"اللہ ہی تو ہے جس نے بنایا تم کو ضعف سے پھر اس ضعف کے بعد قوت بخشی پھر اس قوت کے بعد ضعیف اور بوڑھا بنایا، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

پوری آیت پڑھنے سے ظاہر ہے کہ "خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ" کا مطلب یہ ہے کہ انسان کمزور پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح "خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ" کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورتیں پسلی کی بنی ہیں یعنی پسلی کی طرح ان میں کمزوری اور خم پایا جاتا ہے۔ یہ نسوانی فطرت ہے۔ اس کا لحاظ ضروری ہے۔

(مولانا) محمد فاروق خاں۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۷

زندگی کا راز

جو کم پر راضی ہو جائے
وہی زیادہ پاتا ہے۔

جو زیادہ کے لئے دوڑے
وہ کم سے بھی محروم رہتا ہے
اور زیادہ سے بھی۔

کیسی عجیب ہے

یہ اسلامی سیاست!

پاکستان میں محمد ایوب خاں کی حکومت تقریباً گیارہ سال (۱۹۶۹ - ۱۹۵۸) رہی۔ اس زمانہ میں پاکستان کے اسلام پسندوں کا نعرہ یہ تھا کہ صدر ایوب کی "بنیادی جمہوریت" نے پاکستانی عوام کو، سیاسی اعتبار سے، دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا ہے۔ بنیادی جمہوریت کے بجائے بالغ رائے دہی کے اصول کو پاکستان میں رائج ہونا چاہئے تاکہ جس کے حق میں عوام کے زیادہ ووٹ پڑیں، وہ ملک پر حکومت کرے۔ محمد ایوب خاں کا انتخابی نظام، بنیادی طور پر، اگرچہ وہی تھا جو امریکہ میں کامیابی کے ساتھ رائج ہے، حتیٰ کہ یہ خود اسلام سے بھی قریب تر تھا۔ کیونکہ صدر اول میں خلیفہ کا انتخاب ارباب حل وعقد کرتے تھے نہ کہ تمام بالغ رائے دہندگان۔ تاہم پاکستان کے جذباتی نوجوانوں میں اس تحریک کو بہت سے حامی مل گئے۔ بے شمار نقصانات کے بعد جمہوری تحریک کامیاب رہی اور عوام کی کثرت رائے سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم ہوئی۔ مسٹر بھٹو کو تقریباً چھ سال (۱۹۷۷ - ۱۹۷۱) پاکستان میں حکومت کرنے کا موقع ملا۔

جمہوریت کی بحالی کے باوجود پاکستان میں اسلام کے علم برداروں کو کرسیٔ اقتدار پر جگہ نہ مل سکی۔ اب انھوں نے اپنی تحریک جاری رکھنے کے لئے دوسرا لفظ تلاش کرلیا۔ اب ان کا کہنا تھا کہ مسٹر بھٹو نے دھاندلی سے الیکشن جیتا ہے۔ ورنہ پاکستان کے ۹۹ فی صد عوام ان کے خلاف ہیں۔ یہ بات عقل اور تجربہ کے لحاظ سے ناقابل فہم تھی۔ کسی ملک میں ایک شخص کے مخالفین کی تعداد اگر اتنی زیادہ ہوجائے جتنی کہ مسٹر بھٹو کی بتائی جاتی ہے تو دھاندلی کی کوئی بھی مقدار اس کو کامیاب نہیں کرسکتی۔ مگر پاکستان کے باشندے، خصوصاً مہاجر لوگ، شوروشر کی سیاست سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسلام پسندوں کو دوبارہ اپنے نئے نعرہ کے لئے بہت سے ساتھی مل گئے۔ انھوں نے انتخابی دھاندلی کے خلاف زبردست طوفان برپا کردیا۔ اربہا ارب روپیہ کے نقصان کے بعد بالآخران کی تحریک کامیاب رہی۔ فوجی افسروں نے موقع سے فائدہ اٹھاکر ۵ مارچ ۱۹۷۷ کو حکومت کی کرسی پر قبضہ کرلیا —— انتخابی دھاندلی کو دور کرنے کی کوشش میں فوجی دھاندلی وقوع میں آگئی۔ مسٹر بھٹو نے چند سیٹوں پر دھاندلی کرکے اپنی سیٹوں کی تعداد کو بڑھایا تھا۔ فوجی افسروں نے انتخابات کا تکلف کئے بغیر ہی بزور تخت اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

پاکستان کے نئے حکمراں جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ ۱۸ اکتوبر کو نیا الکشن ہوگا۔ مگر اب پاکستان کے اسلام پسندوں پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ مسٹر بھٹو، وزیر اعظم کے عہدہ سے معزول ہونے کے بعد، دھاندلی کی طاقت سے محروم ہوچکے تھے۔ اس کے باوجود ان کے جلسے اور جلوسوں میں عوام کی سب سے زیادہ بھیڑ جمع ہو رہی تھی۔ اسلام کے علم برداروں کو اندیشہ ہوا کہ اگر الکشن ہوتا ہے تو مسٹر بھٹو دوبارہ کسی "دھاندلی" کے بغیر ہی کامیاب ہوجائیں گے۔ ان کی اسلام پسندی نے یہاں بروقت ان کی مدد کی اور وہ ایک نیا مفید مطلب نعرہ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ نعرہ تھا: "پہلے احتساب، پھر انتخاب"

یہ نعرہ پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے لیے بروقت قیمتی مدد ثابت ہوا۔ کیوں کہ وہ بھی ٹھیک اسی سیاسی مشکل میں گرفتار تھے جس میں پاکستان کے اسلام پسند گرفتار ہیں۔ اندر ملہوترا نے پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات پر ایک تبصرہ شائع کیا ہے۔ اس میں وہ بجا طور پر لکھتے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق موجودہ حالات میں صرف اپنی موت کی قیمت ہی پر الیکشن کر سکتے تھے۔ کیوں کہ سارے امکانات بتا رہے تھے کہ الیکشن کا نتیجہ بھٹو کے حق میں برآمد ہوگا۔ اور بھٹو کی کامیابی کے معنی میں جنرل ضیاء الحق کی موت:

EITHER THE GENERAL (ZIA) ELIMINATES MR. BHUTTO OR HE SHOULD BE PREPARED FOR HIS OWN ELIMINATION.

جنرل ضیاء الحق یا تو مسٹر بھٹو کو ختم کر دیں۔ یا پھر انھیں خود اپنے خاتمہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

(ٹائمس آف انڈیا، ۳۰ نومبر ۱۹۷۷)

علم برداران اسلام کے مطالبہ نے فوجی حکمرانوں کو موقع دے دیا کہ وہ اپنے اوپر ذمہ داری لئے بغیر "۱۸ اکتوبر" کے الکشن کو غیر متعین مدت تک کے لئے ملتوی کر سکیں۔ انھوں نے فوراً اس مطالبہ کو مان کر الکشن کے التوا کا اعلان کر دیا۔ اور مجرمین کے "احتساب" کے مقدس فریضہ میں مشغول ہو گئے۔

تاہم یقینی ہے کہ "عمل احتساب" کی تکمیل بھی اسلام کے علم برداروں کے لئے تخت اقتدار تک پہنچنے کا زینہ نہ بن سکے گی۔ اب دیکھنا ہے کہ ان کا زرخیز سیاسی ذہن اس کے بعد کون سا نیا نعرہ تلاش کرتا ہے۔

دسمبر ۱۹۷۷ کے پہلے ہفتہ میں خان عبد الولی خاں کی رہائی نے پاکستان کو دوبارہ دس سال پہلے والی سیاست کی طرف لوٹا دیا ہے۔ اُس وقت محمد ایوب خاں کے زور کو توڑنے کے لئے بنگالی لیڈر کو باہر لایا گیا تھا۔ اب مسٹر بھٹو کا زور توڑنے کے لئے پختونی لیڈر کو میدانِ سیاست میں داخل کیا گیا ہے۔ اگر یہی اسلامی سیاست ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ غیر اسلامی سیاست پھر کس دوسری چیز کا نام ہوگی۔

حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں مصر سے جزیہ کی آمدنی ایک کروڑ بیس لاکھ درہم سالانہ تھی۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں وہ صرف پچاس لاکھ رہ گئی۔ کیوں کہ مصر کے قبطی عیسائی اس مدت میں کثرت سے مسلمان ہو گئے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں یہ رقم اور بھی کم ہو گئی۔ مصر کے عامل نے ان کو لکھا کہ "قریب ہے کہ مصر کے تمام ذمی مسلمان ہو جائیں اور جزیہ کی آمدنی بالکل بند ہو جائے"۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا: اگر ایسا ہوا تو میں بہت خوش ہوں گا۔ کیوں کہ اللہ نے اپنے رسول کو داعی اسلام بنا کر بھیجا تھا نہ کہ محصول وصول کرنے والا"۔ خراسان کے عامل نے ایک بار لکھا کہ "بہت سے لوگ جو مسلمان ہو گئے ہیں، انھوں نے جزیہ سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ایسا کیا ہے۔" اپنے دعوے کے ثبوت میں اس نے لکھا کہ "یہ لوگ کلمہ پڑھ لیتے ہیں مگر ختنہ نہیں کراتے"۔ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا: "اللہ نے اپنے رسول کو داعی بنا کر بھیجا، خاتن بنا کر نہیں بھیجا"

مسلمان اگر دوسری قوموں سے دنیوی حقوق کا جھگڑا شروع کر دیں تو یہ رسول کے ساتھ غداری کے ہم معنی ہوگا۔ خواہ وہ رسول پر درود و سلام پڑھ کر ایسا کر رہے ہوں۔

ایک لطیفہ

ڈاکٹر پرمود کمار نے دہلی سے امراض نسواں (GYNAECOLOGY) میں خصوصی ڈگری لی اور اس کے بعد لندن (آکسفورڈ اسٹریٹ) میں اپنا مطب کھولا۔ ایک روز ایک انگریز خاتون تیزی سے ان کے مطب میں داخل ہوئی۔ "ڈاکٹر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی بات کو کس طرح بیان کروں" اس نے کہا اور پھر ایک وقفہ کے بعد بولی:

I THINK I HAVE A TOUCH OF THE SUN

ڈاکٹر کمار نے اس جملہ کا مطلب یہ سمجھا کہ خاتون غالباً کسی کھلے مقام پر گئی تھیں اور وہاں ان کو تیز دھوپ لگ گئی ہے۔ "آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" ڈاکٹر نے مریضہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا "آپ ٹھنڈے مشروبات، خاص طور پر لیموں برف کے ساتھ لیجئے اور آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی،، اگر جلد پر کچھ اثر محسوس ہو تو زیتون کا تیل یا کریم مل لیجئے۔"

خاتون پریشان چہرہ پر مزید حیرانی کے اثرات لئے ہوئے باہر نکل گئی اور ڈاکٹر کمار یہ سوچنے لگے "انگریز خواتین آخر اتنی معمولی معمولی باتوں کے لئے کیوں ڈاکٹر کے پاس آتی ہیں"

شام کو وہ اپنی قیام گاہ پہنچے۔ وہاں مسز گلوریا، ان کی انگریز بیوی نے ان کا استقبال کیا۔ جب دونوں کھانے کی میز پر اکٹھا ہوئے تو انگریز خاتون نے دوبارہ وہی جملہ کہا جس کو وہ اپنے مطب میں ابھی سن آئے تھے:

DARLING, I THINK I HAVE
A TOUCH OF THE SUN

ڈاکٹر کمار نے حیرانی کے ساتھ کہا "نہیں نہیں۔ اس طرح تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ لندن کی خواتین ہر وقت بس سورج کی ہی بات کرتی ہیں۔ دیر تک الفاظ کے تبادلہ کے بعد گلوریا نے محسوس کیا کہ اس کا ہندوستانی شوہر اصل بات کو سمجھ نہیں رہا ہے، اس نے ہنستے ہوئے کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ ہم جلد ہی تین ہونے والے ہیں"

انگریزی زبان میں ایک عورت اپنے حاملہ ہونے کو درجنوں طریقے سے بتا سکتی ہے۔ مذکورہ بالا جملہ بھی اسی قسم کا ایک استعاراتی انداز ہے۔ جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "مجھے سورج چھو گیا ہے"

اعلان

الرسالہ ایک تعمیری جدوجہد بھی ہے اور ایک تاریخ بھی۔ اس کی مستقل اہمیت کی بنا پر اس کی مجلد فائل فراہم کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

فی الحال الرسالہ کے ابتدائی دس شمارے (نمبر ۱ سے لے کر نمبر ۱۰ تک) محدود تعداد میں عمدہ جلد میں مجلد کرائے گئے ہیں۔ جو لوگ مکمل فائل محفوظ رکھنے کا شوق رکھتے ہوں، وہ اس کو قیمتاً حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک جلد (شمارہ نمبر ۱ — ۱۰) کی قیمت مع محصول ڈاک ۳۰ روپے ہے
قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں۔

منیجر

Single Copy Rs. 2.00.

Regd No. D (D) 532
REGD R.N. NO. 28822/76
JANUARY 1978

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi-110006 (India)